جملہ حقوق محفوظ

نکات موزی

حصّہ دوم

از

مُلّا موزی

سنہ ۱۹۲۹ء

دارالاشاعت پنجاب لاہور

بار اوّل ۱۰۰۰ قیمت

اَن پورنا کا مندر

مصنفہ

شرمتی راپا دیوی کمار ی

مترجمہ

پروفیسر رام سروپ کوشل

ایک نہایت ہی اعلیٰ اخلاقی

اور سبق آموز ناول کا اُردو

ترجمہ۔ اصل کتاب بنگال میں

اس قدر مقبول ہوئی۔ کہ ہزاروں

جلدیں ہاتھوں ہاتھ فروخت

ہوگئیں۔ اور اس قدر دلچسپ

سمجھی گئی۔ کہ انگریزی میں ترجمہ

ہوئی۔ قیمت عہ ر

ملنے کا پتہ

دارالاشاعت پنجاب لاہور

Taj Tahir Foundation

Taj Tahir Foundation

Taj Tahir Foundation

نکاتِ رموزی

حصّۂ دوم

از

ملّا رموزی

سنہ ۱۹۲۸ء

دار الاشاعت پنجاب لاہور

بار اوّل

قیمت

Taj Tahir Foundation

Taj Tahir Foundation

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	نمبر صفحہ
۱	مقدمہ	۱
۲	دیباچہ	۱
۳	نکات	۷
۴	قانونی زندگی	۲۱
۵	ہمارے رسالے "سیر گل" کی بابت معترضین	۳۰
۶		۴۳
۷	پشاور تک مگر علی گڑھ تک	۵۴
۸	"سالگرہ عید نمبر" پر کچھ	۷۶
۹	افسانہ نمبر دیکھ کر	۸۷
۱۰	قربانی اور موٹر لاری	۹۵
۱۱	مخزن کی سالگرہ	۱۱۱
۱۲	ٹورنامنٹ	۱۱۹
۱۳	مشاعرہ کا علی گڑھ	۱۳۴
۱۴	نکات و لطائف	۱۳۹

Taj Tahir Foundation

نمبر شمار	مضمون	نمبر صفحہ
۱۵	کالا آدمی	۱۴۳
۱۶	مضمون نگاری	۱۵۴
۱۷	میٹھی عید	۱۶۹
۱۸	رائے	۱۸۱
۱۹	انیسویں صدی کا خدمتگار	۱۹۶
۲۰	مشاعرہ	۲۱۰
۲۱	غنودگی	۲۱۵
۲۲	پھر بمبئی تک	۲۲۳
۲۳	سنہ ۱۹۲۶ء کا مہمان	۲۳۵
۲۴	خوش طبعی	۲۴۸

Taj Tahir Foundation

مُقدمہ

مُلّا رموزی اور ظرافت نگاری

ایک علمی تبصرہ

(از حضرت پروفیسر عبدالقادر سروری ایم۔اے
ایل ایل بی ایڈیٹر مجلہ مکتبہ حیدر آباد دکن۔)

مسرت طلبی اور لطف اندوزی کا جذبہ انسانی سرشت میں داخل ہے + ایک خشک مزاج سے خشک مزاج انسان کے لئے بھی فیاض فطرت اس جذبہ کو کسی نہ کسی صورت میں خوش وقتی کا ذریعہ بلکہ حقیقت میں اس کی حیات کا سہارا بنا کر پیدا کرتی ہے۔ ورنہ زندگی سے توقعات اور امیدوں کا بالکل منقطع ہو جانا۔ رشتۂ زندگی کا منقطع ہو جانا ہے + یہ ایک دوسری بات ہے کہ ہر طبیعت اپنی فطری مناسبت کی بدولت خاص خاص امور میں اپنی تسلّی ڈھونڈ لیتی ہے۔ ایک دولتمند اپنے عیش و عشرت کے سامان میں جو لطف و سرور حاصل کرتا ہے۔ وہی ایک مزدور دِن بھر کی تھکا دینے والی محنت کے بعد اپنی بیوی اور بھولے بھولے بچّوں کے درمیان

محسوس کرتا ہے +

جسم کی طرح دماغ کا بھی حال ہے۔ سنجیدہ مطالعہ کی کثرت کے بعد طبیعت اپنی غذا یعنی لطیف تحریروں میں اپنی راحت ڈھونڈھتی ہے۔ اگر یہ غذا اس کو بہ سہر نہ آئے تو بد مزگی پیدا ہو جانے کا احتمال ہے۔ یہی سبب ہے کہ دنیا کی کوئی زبان ایسی تحریروں سے خالی نظر نہیں آتی۔ لطیف تحریریں سنجیدہ مطالعہ کا نہ صرف موازنہ بن جاتی ہیں بلکہ ان سے ادبیات کے سارے جسم میں روح کی سی ایک لہر دوڑنے لگتی ہے +

یہاں ہم کو لطیف تحریروں کے عناصر یا ان کی پیدائش پر بحث کرنا نہیں۔ بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ تمام زبانوں میں سنجیدہ تحریروں اور لطیف و ظریفانہ تحریروں کا ساتھ روز و شب کا سا ساتھ ہے۔ ایک کی مدد دوسرے سے ہوتی ہے۔ لطیف تحریریں سنجیدہ تحریروں کے بوجھ کو ہلکا کرتی ہیں +

وہ شخص جس کی زندگی کی مصروف ساعتوں میں سیر و تفریح کے لئے بدقت کوئی وقت نکل سکتا ہے۔ لطیف تحریروں کو راحت کا سامان اور اضطراب کے بعد سکون تصور کرتا ہے۔ یہ اس کی زندگی کا وقفہ ہیں۔ جو اس کو دم لے کر آگے چلنے پر مستعد بنا دیتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو چیز اس پایہ کی اہمیت رکھنے والی ہوگی۔ اس کی پرورش میں ہر علم دوست حصہ لئے

بغیر نہیں رہ سکتا +

لطیف اور ظریف تحریروں کی نوعیت اس قدر ہوتی ہے کہ اس کو فن بنا کر قید و بند میں قطعاً مقید نہیں کر سکتے۔ جو کچھ ہو سکتا ہے وہ یہ کہ اعلےٰ ظرافت کی اشاعت اور بدنما تحریروں کو روکنے کے لئے صرف چند عام فہم ضروری حدود قائم کر لی جاتی ہیں۔ جن کا احترام ہمارے مصنفین کر سکیں اور اس افراط و تفریط کے مذموم راستہ سے بچ کر چلیں جو تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے +

اس میں شک نہیں کہ ظرافت نگار اس امر پر مجبور ہے کہ اپنی تحریروں کا مطمح نظر کسی واقعۂ خاص کو یا کسی رواج معاشرت یا شخص کو بنائے۔ اسی لئے ہمیشہ ظرافت نگاری۔ خاکہ کشی کے دائرہ میں شامل ہو جاتی ہے۔ تاہم اس کے باوجود اس کا لحاظ ضروری ہے کہ اعلےٰ پایۂ ظرافت میں ایک عام فہم کیفیت ہونی چاہئے۔ یعنی یہ نمونوں سے متعلق ہو اور کسی ذی روح انسان کے احساسات کو اس سے ٹھیس نہ لگے۔ ورنہ یہ ایک اخلاقی بلکہ قانونی جرم تصوّر ہوگا۔ جس تحریر کا مقصد لطف افزائی ہو اگر اس سے کسی خاص شخص کو تکلیف پہنچے تو وہ اپنے منشائے تخلیق سے بالکل بیگانہ ہے۔ مخصوص چیزوں کو مذاق کا موضوع بنانا صرف اسی حد تک جائز ہے۔ جہاں تک ان کا

عوام سے تعلق ہو - یہ دشواری اس وجہ سے پیش آتی ہے کہ ظرافت کا موضوع انسان کی وہ خامیاں ہوتی ہیں جو قابل اصلاح سمجھی جاتی ہیں - ہر حالت میں ایک ظرافت نگار کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ وہ جن چیزوں پر تنقیدی نظر ڈال رہا ہے اُن کے مقابل وہ مخاصمانہ یا مخالفانہ طرز نہ اختیار کرلے - بلکہ اس کی ذہنیت ایک اُستاد کی سی ہونی چاہیئے جس کی تنقید کا مقصد سوائے ہمدردانہ اصلاح کے اور کچھ نہیں ہو سکتا ؛

ظرافت میں جہاں تک تلخی پیدا نہ ہو بہتر ہے - لارڈ میکالے نے اس کی خوبی کا ایک اپنا معیار یہ قائم کیا ہے کہ اس کو پڑھ کر قاری کے قلب اور دماغ کے سرور کا نمونہ صرف ہونٹوں پر کی مسکراہٹ کی لہر سے ظاہر ہو - وہ مشہور فرانسیسی ظرافت نگار - والنٹیر کی ہنسی سے تڑپا دینے والی تحریروں کو شوریدہ سری سمجھتا ہے - اور اس بنا پر ایڈیسن کو والنٹیر پر ترجیح دیتا ہے - اول الذکر کی تحریریں اس کے معیار کی خوبی پر ٹھیک ٹھیک اُترتی ہیں ؛

ان دو خصوصیات کے علاوہ اس قسم کی تحریروں میں ایک خاص چیز کی اور ضرورت ہے یہ سنجیدگی اور متانت ہے - بظاہر تو یہ ایک متضاد سی بات ہے کہ ظریفانہ تحریریں سنجیدہ بھی ہوں - لیکن درحقیقت ظرافت نگار ذرا سی سعی کی بدولت

مبتذل خامہ فرسائی سے بچ سکتا ہے۔ حتی الامکان اس کی کوشش کی جانی چاہیئے کہ پڑھنے والے کو ایک ذہنی مسرت اور انبساط حاصل ہو جائے۔ یہ منزل نہایت دشوار گزار ہوتی ہے۔ کیونکہ ذرا سی لغزش سے سنجیدہ خرامی میں فرق آجاتا ہے۔ ہر لطیف تحریر کی طرح ظرافت نگاری کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ جہاں مقصد کا رشتہ گم ہوا۔ لغویات کا شہزادہ بکھرا ہوا دکھائی دیگا۔ اسی لئے ظریف تحریروں کا کوئی اعلیٰ مفید اور عمومی مقصد ہونا چاہیئے۔ یہی عنصر ظریفانہ تحریروں کو وقتی دلچسپی کی منزل سے آگے بڑھا دیتا ہے۔ ایسی مثال میں ملا رموزی کی وہ ظریف تحریریں دیکھئے جو سنجیدہ مسائل پر حاوی ہیں اور اسی لئے وہ دائمی اور ٹھوس مسرت سے لبریز ہیں۔

ہم نے ابھی اوپر بیان کیا ہے کہ دنیا کی بہت کم زبانیں لطیف تحریروں کے چٹخاروں سے خالی ملینگی۔ جہاں تک ہماری زبان اردو کا تعلق ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے پاس ظرافت کی ایسی قلت تو نہیں ہے۔ لیکن ان تحریروں کی صورت دوسری ہے۔ ابتدائی زمانہ میں صرف شعراء نے کسی نہ کسی وجہ سے اس دائرہ میں قدم تو رکھا۔ لیکن علمی حلقوں میں ان کا یہ فعل مردود گنا جاتا تھا۔ میر تقی میر تاج شعراء اردو کی سنجیدہ دماغی اور خودداری

سب پر روشن ہے۔ ان کی شاعری کی خصوصیت ظرافت نہیں۔ لیکن جب وہ ایک "پُرخور" کی ہجو لکھتے ہیں تو کہیں کہیں سنجیدگی کی شاہراہ سے بھٹک جاتے ہیں اور جب میاں جرأت اپنی شاعری کے متعلق ان کی رائے دریافت کرتے ہیں تو وہ اس کو "چوما چاٹی" سے زیادہ رتبہ دینا نہیں چاہتے ٭

حضرت میر۔ ظریف شاعر نہیں تھے۔ انہوں نے صرف اپنے حق کرنے والوں کی ہجویں لکھی ہیں۔ جہاں یہ تنگ ہو جاتے ہیں لطیف تحریر کی قربانی سے حریف پر غالب آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر جوش کے فقدان سے ان کی ظرافت پھیکی پڑ جاتی ہے۔ سودا قصیدے کی طرح ہجو کے بھی "بادشاہ" ہیں۔ ان کے کلام میں ظرافت کا عنصر مقابلتہً زیادہ نظر آتا ہے۔ ان کی ظرافت "ستم ظریفی" ہوتی ہے۔ مقابل کے حق میں ان کی حالت اُس بلی کی سی ہوتی ہے جو شکار کو قابو میں کر لینے کے بعد اُس سے اُس وقت تک خوش فعلیاں کرتی رہتی ہے جب تک وہ بے دم نہ ہو جائے۔ اسی لئے ان کے پاس قارئین کی دلچسپی کا مواد زیادہ ہوتا ہے۔ ان کے قصائد "تضحیک روزگار"۔ ہجو اسپ وغیرہ اچھی مثالیں ہیں ٭

سید انشا۔ جرأت۔ رنگین۔ جان صاحب اور اُن کے تابعین کے کلام میں ظرافت کا عنصر زیادہ ہے اور ڈھونڈھنے سے اچھے

نمونے بھی دستیاب ہو سکتے ہیں - لیکن ان کے کلام کا بیش تر حصّہ بتذل ہے +

متذکرہ بالا شاعروں میں انشاء کی اُپج سے بھری ہوئی طبیعت اس مقصد کے لئے سب سے زیادہ موزون تھی - لیکن کچھ تو شدّت طبیعت اور کچھ بگڑے ہوئے مذاق کی رعایت نے ان کی تحریروں کو انسائیٹ کے مذموم نقطہ تک پہنچا دیا - روشن خیال طبقہ کی بے توجہی بھی ان کی بے راہ روی میں ممد و معاون ثابت ہوئی - جس طرح غالب کے احباب نے مشکل گوئی کی عادت ان سے چھڑائی اگر مذکورہ بالا طبقہ کے معاصرین اپنے ساتھیوں کو راہ راست پر لے آتے تو اُردو زبان اعلےٰ ظریفانہ تحریروں سے ایسی بیگانہ نہ رہتی +

جرأت - انشاء وغیرہ ایسے مرشدوں کے مریدوں نے ظرافت کو لغویّت کے مرادف بنا کر اُردو ادب میں "زٹلیّات" کا خاصہ ذخیرہ فراہم کر دیا +

اُردو کے لئے فارغ البالی کی صورت میں لکھنؤ کے نواب آصف الدولہ کے زمانے کا سا زمانہ پھر آ ہی نہیں سکتا تھا اور لطیف تحریروں کی پیدائش کے لئے ایسا ہی زمانہ درکار ہے اسی لئے جس قدر کام اس خاص صفت ادب میں اس وقت ہوا پھر نہ ہو سکا - اس کی نوعیت سے ہمیں یہاں بحث نہیں ہے +

Taj Tahir Foundation

غالبؔ۔ مومنؔ اور ذوقؔ میں جو قدیم دبستانِ شاعری کے آخری اساتذہ ہیں۔ مومن کی حد سے بڑھی ہوئی خودداری اور ذوق کی سنجیدگی اور علم و فضل نے اُنہیں اس طرف قدم بڑھانے نہ دیا۔ غالبؔ کی طبیعت اس طرف خاص طور سے مائل تھی۔ ان کی سرشت میں جو اعلےٰ ظرافت مضمر تھی۔ اس کا آئینہ ان کی شاعری خصوصاً غزل گوئی کی سی غیر فطری شاعری نہیں ہو سکتی۔ البتہ غالبؔ کے خطوط ان کی فطرت کے اچھے مظہر ہیں۔ اس "حیوانِ ظریف" کے سوانح نگار حالیؔ پانی پتی نے ان کی "یادگار" میں غالبؔ کے اس خاص کردار پر اچھی روشنی ڈالی ہے ٭

خود حالیؔ قوم کی اصلاح کا بیڑا اُٹھائے ہوئے تھے۔ رہے آزادؔ سو ان کی شعری پیداوار قلیل ہے۔ لیکن ان کے نثری کارناموں میں "آبِ حیات" کا نیم ظریفانہ اسلوب خاص آزادؔ ہی کا پیدا کردہ تھا اور انہیں پر ختم ہو گیا ٭

انگریزی اثر کے بعد سے ذہنیتوں کے انقلاب نے قدیم ظرافت نگاری کی طرز بھی بدل دی۔ "پنچ" کے نمونے پر "اودھ پنچ" کے مرکز سے ظرافت نگاری کی وہ نئی داغ بیل پڑی جو اب منڈھوں چڑھتی نظر آ رہی ہے۔ اس کی پیدائش کا باعث تو انگریزی ظرافت کے نمونے ہوئے۔ لیکن اس کے نشو و ارتقاء

میں ملک کی سیاسی فضا بے حد معاون ہوئی۔ پہلے پہلے تو اجنبی حکومت کی سخت گیریوں نے لوگوں کو بھڑکایا۔ لیکن قانونی احتساب کے خوف نے لب پر آئی ہوئی باتوں کا بھی گلا گھونٹنا شروع کیا۔ مگر بے چینی کا اظہار پھر بھی ضروری تھا۔ اس کش مکش میں بسکار خویش ہشیار۔ "دیوانوں" نے اپنے اجنبی رہنماؤں کی تقلید میں پردے پردے کے اندر شکوہ و شکایت شروع کی۔ آخر کار ظفر علی خاں اور "ملا رموزی" کی کوششوں نے اس راستہ کو بالکل صاف کر دیا +

"ملا رموزی" میں ادبیت کی فراوانی سے اردو ظرافت نگاری کو بے حد نشو و نما حاصل ہوا۔ اور پھر ان کی حد سے بڑھی ہوئی حساس اور نکتہ رس طبیعت نے ان کے قلم کی جولانگاہ کو بھی وسیع اور ملک کی تمام سیاسی اور معاشرتی خامکاریوں پر حاوی کر دیا +

"ملا رموزی" کے لئے ؎

ہوئی جو صبح رکھ کر کان پر گھر سے قلم نکلے

مگر اس طرح کہ نوٹ بک ساتھ نہیں لیکن واقعات تمام محفوظ اور قلمبند نظر آتے ہیں۔ ان کے مضامین میں کثرتِ واقعات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تلاشِ معاش میں نہیں بلکہ تلاشِ مواد ہی میں تمام سیاسی۔ معاشرتی۔ اخلاقی اور مذہبی اداروں کا چکر لگایا کرتے ہیں۔ حالانکہ ان وسیع معلومات کے لئے ان کی فقط قوتِ اندازہ کام کرتی ہے۔ مگر کس قدر عمیق اور وسیع؟ کبھی وہ

گھر ہی میں بیٹھے ہوئے مدیران صحائف کی نفسیات کا مطالعہ کر لیتے ہیں۔ مگر نہایت دقیق اور مکمل۔ کبھی کبھی وہ بے ضرورت ہی سہی مگر "پنجاب میل" میں سفر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ قومی وسیاسی جلسوں۔ میلے ٹھیلوں میں کانگرس اور کانفرنس میں موجود رہتے ہیں تو پھر "علی گڑھ جبلی" کی تقریب میں ان کی حاضری نہایت ضروری ہو جاتی ہے۔ غرض انسانیت اور نفسیات انسانی کا پوشیدہ سے پوشیدہ اور دور سے دور گوشہ بھی ان کی برق نگاہی سے بچا ہوا نظر نہیں آتا +

کثرتِ نگارش اور تخصیص اسلوب کے اعتبار سے جو امتیاز "ملا رموزی" کی ظریفانہ تحریروں کو حاصل ہے وہ اوروں کے بس کی بات نہیں۔ اخبارات اردو میں ظرافت نگاری کا جو لزوم اور فرضیت آج دیکھی جا رہی ہے اور ہر اردو اخبار میں "خواہ مخواہ کی ظرافت" کے جو کالم لازمی کر دئے گئے ہیں یہ بھی "ملا رموزی" کی کثرتِ پیداوار کا ایک واقعی تاثر ہے۔ جس نے مدیران صحائف کو یقین دلا دیا کہ "اب بغیر ظرافت کے اخبار مقبول ہی نہیں ہو سکتا" ورنہ "ملا رموزی" سے قبل کے اخبار ہی فائل لازمی ظرافت نگاری سے یکسر خالی کیوں ہیں؟ اب ان کی لطافت نگاری کی مقبولیت نے ملک کے مخصوص مقصد علمی و ادبی رسائل کو بھی متاثر کیا اور بیش تر رسالے اُن کے فیضِ تحریر

سے بہرہ یاب ہو رہے ہیں۔ کیا یہ "ملّا رموزی" کے کرداری استقلال کا روشن ثبوت نہیں ہے کہ اپنے مادی ایثار کے باوجود بھی وہ اپنے اسلوب کی حفاظت میں مشکلات سے تنگ حوصلہ نہیں ہوتے؟ ظرافت نگاری سے اُنہیں اس قدر گہرا تعلق پیدا ہو گیا ہے کہ "ملّا رموزی" اور "ظرافت" دو علیٰحدہ چیزیں ہی نہیں معلوم ہوتیں ٭

"ملّا رموزی" کی تحریروں پر ایک تجرباتی نظر ڈالنے کے بعد کئی چیزیں ایسی ہیں جن سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سب سے پہلی اصولی خصوصیت۔

۱۔ ظرافت نگاری کی بے تکلفی اور برجستگی ہے۔ اِس کے بغیر کلام میں لطافت نہیں پیدا ہو سکتی۔ بناوٹ اور آورد سے بھری ہوئی ظرافت گرانی خاطر بن جاتی ہے "ملّا رموزی" کی ظرافت میں بے ساختگی اور برجستگی کا حسن سطر سطر سے جلوہ گر ہے ٭

۲۔ اصلاحی تحریریں قاری پر ہمیشہ ایک اثر چھوڑ جاتی ہیں اب یہ کمال صاحب تحریر کا ہے کہ وہ اس اثر کو مغموم بنا دے یا مسرور "ملّا رموزی" کی تحریروں کا یہی کمال ہے جو ان کے معاصرین میں کسی کو حاصل نہیں کہ اُن کا مغموم سے مغموم موضوع بھی قاری کے دل پر پُر لطف و پُر سرور اثر چھوڑ جاتا ہے ٭

۳۔ کسی مفہوم کو عملی مثال سے سمجھانا مضمون نگار کا اصولی فرض ہے اور ایسا کیا بھی جاتا ہے۔ لیکن اس تکلف سے

کہ مثال سے صاحب مضمون خود کو ہمیشہ محفوظ و پوشیدہ رکھتا ہے جو ایک نازک ترین نقص ہے۔ مگر ملّا رموزی اس مثالی حصّہ کو اس بے باکی۔ بے خوفی اور جرأت سے بیان کرتے ہیں جس سے ان کے ذوقیات اور زندگی کا ہر پہلو قاری کے سامنے آجاتا ہے اور خطاب و مخاطبت کی یہی وہ تکمیل ہے جسے سب سے پہلے ملّا رموزی نے پیش کی ٭

۴۔ عام طور پر ملّا رموزی کی تحریریں احاطت و ہمہ گیری کا رنگ رکھتی ہیں۔ لیکن جہاں کہیں وہ مخصوص ہو جاتی ہیں اس لطیف انداز سے کہ مخاطب تحریر بھی اپنی فضیحت پر آپ ہی ہنسنے لگتا ہے ٭

۵۔ ان کی تحریروں کا وصف قہقہہ کی شوریدگی پیدا کرنا نہیں بلکہ فضائے دماغ کو سرور اور انبساط کے سرمایہ سے مالا مال کر دینا ہے۔ عامیانہ اور سوقیانہ امور میں بھی سنجیدگی اور متانت سے نہیں گزرتے۔ یہ اس قدر نازک راہ ہوتی ہے کہ ذرا سی لغزش بھی قعر ذلت میں گرا کر چھوڑتی ہے ٭

۶۔ مشاہدۂ فطرت انسانی ظرافت کی روح رواں ہے۔ ظرافت نگار جب تک انسانیت کے ہر نمونے کا بغور مطالعہ نہ کرے اور اُن کے قلوب کی گہرائیوں میں غوطہ زن نہ ہو وہ ہر طبقے اور ماحول کے آدمیوں کی نفسیاتی باریکیوں کو نہیں سمجھ سکتا۔ یہی

مشاہدہ اس کو "چھپے رستموں" کے "پتھرے کھولنے" پر قادر بنا دیتا ہے۔ "کالا آدمی یا فیض آباد کے سفیر" عوام۔ پولیس مسافروں لیڈروں اور حکومت کی نفسیات پر کیا خوب روشنی ڈالی ہے ہمارے تمدن۔ معاشرہ اور اخلاق پر ملمع کاری کے لباس کو کیسے چاک کیا ہے ÷

۷ "ملا رموزی" کی ہمیشہ باقی رہنے والی تحریروں میں بہت کم ایسی ملینگی۔ جن میں "ظرافت صرف ظرافت کی خاطر" کا اصول مدنظر رکھا گیا ہو۔ ان کی کسی تحریر کا مقصد ہمارے مذموم رواجات کی برائیوں کا استیصال ہے۔ کسی کے ذریعہ ہماری حالت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ کہیں وہ اوڈیسن کی طرح ہمارے معاشرتی عیوب بے نقاب کرتے ہیں۔ جو باتیں مصلحین کی زبانوں پر بھی نہیں آتیں وہ اُن کی زبان قلم سے بے تامل نکل پڑتی ہیں اور ان کی اور اکی وسعت کا تو جواب نہیں کہ جس مقام تک ہمارے واعظین اور لیڈروں کا گزر بھی نہیں یہ وہاں بے روک داخل ہو جاتے ہیں ÷

غرض ابھی ایک وسیع اور شاندار مستقبل ہمارے سامنے ہے۔ "جس کا راستہ "ملا رموزی" نے کھول دیا ہے۔ یقیناً آئندہ ملا رموزی کی ظرافت نگاری اخبارات و رسائل سے نکل کر مستقل ادبیات میں جگہ کر لینگی۔ اور قوم کے پژمردہ دلوں

کے لئے مسرتِ پائیدار ثابت ہوگی اور ملک کے تاریک ترین گوشوں
کے لئے بھی روشنی کا کام دے گی - اسی لئے میں ملّا رموزی
کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ کی نثری اور ادبی خدمات اب بتدریج
ادبیّاتِ اُردو کا جزءِ لازم بن رہی ہیں اور "تاریخ ادبیاتِ اُردو"
آپ کا نام ہمیشہ عزّت و شکر گزاری سے محفوظ و برقرار رکھیگی-
والسلام ٭

Taj Tahir Foundation

گلابی اُردُو

نکاتِ رمُوزی کا وہانی دیباچہ

(از مُلّا رمُوزی صاحب بقلم خود)

اما بعد اے محترم قلی مزدورو!!!

البتہ تحقیق گواہی دیتے ہیں ہم اُوپر اِس بات کے۔ کہ اگرچہ مزدوری کرتے ہو تم اور بستر سوار کرتے ہو تم اوپر ریل کے۔ وقت آنے اور جانے ریل کے مسافروں انگریز اور مسافروں ہندوستانی کے۔ مگر وقت لینے مزدوری کے سلام کرتے ہو تم انگریزی مسافروں کو ٹیڑھے ہو کر۔ اے جھک جھک کر۔ مگر قسم ہے تمہاکو فردشوں ہند کی۔ کہ لڑائی لڑتے ہو تم ساتھ ہندوستانی مسافروں کے۔ اور جھگڑتے ہو تم اُوپر مزدوری کے ساتھ مسافروں غریب اور افلاس کے مارے ہوئے ہندوستان کے۔ اور جو کم دے مزدوری کوئی تم کو ہندوستان کا تم کو تو بستر اُس کا اوپر فرش زمین پلیٹ فارم اسٹیشن کے پھینک دیتے ہو تم۔ اور ڈانٹ دیتے ہو تم اُس مسافر غریب کو۔ یا پھر چھوڑ دیتے ہو اوپر پلیٹ فارم کے لوٹا اُس کا۔ یا مبلغ ایک صندوق اُس کا۔ یا انکار سخت کرتے ہو تم اُٹھانے سے بستر کسی غریب مسافر ہندوستان کے۔

پس تحقیق سبب سے ایسی زیادتیوں تمہاری کے غالب لایا ہے اللہ انصاف کا کرنے والا اوپر تمہارے انگریزوں کو۔ کہ اوپر اسٹیشنوں ریل کے

مارتے ہیں وہ تم کو نوک جوتے اپنے سے - آے ٹھوکر - یہاں تک کہ مر
جاتے ہو تم اور اکثر تمہارے + پھر جب وفات پا جاتے ہو تم اوپر اسٹیشن
کے یا اندر شفاخانے انگریزی کے - تو بیچ اخباروں کے اعلان کرتے ہیں
کہ مر گیا مبلغ ایک قلی مزدور سب سے پھٹ جانے تلی کمزور اپنی کی کے پس
اگر ترک کر دو تم بدسلوکی ہمراہ ہندوستانی مسافروں کے اور ترک کر دیں
ہندوستانی ٹکٹ کلکٹر پکڑنا اور پولیس کے حوالہ کرنا ہندوستانی مسافروں
فاقہ کش کا - تو کوتوال شہر بنادے اللہ تم کو - اور ہر ایک تم میں سے
کرے حکومت بیچ عدالتوں ہندوستان کے - کہ جہاں تباہ ہو جاتے ہیں -
ہندوستانی کر کے فائر مقدمہ اوپر قومی بھائیوں اپنے کے ذریعہ سے قُرقیوں
اور ڈگریوں کے + پس اگر ترک کر دیں ہندوستانی مقدمہ بازی ساتھ قومی
بھائیوں اپنے کے تو دور کر دے اللہ قدرت والا زنانہ پن مزاج سے ہندوستانی
طلبہ کے - کہ سبب سے استعمال کوٹ پتلون ماسٹروں اور پروفیسروں
ہندوستانی کے دور ہو گئی ہے محبت اور عزت ہندوستانی طلبہ سے لباس
ملکی اپنے کے لی +

پس لاجرم سب تعریف واسطے اُس اللہ مہربان قدرت والے کے ہے
کہ جو غالب لایا مصطفٰے کمال پاشا کو اوپر فوجوں یونان کے - اور غالب
لایا ذہ مارشل رضا شاہ پہلوی کو اوپر فوجوں روسی اور انگریزی کے - اور یہی
ہیں وہ دونوں مسلمان کہ تھے پہلے وہ مبلغ ایک سپاہی - مگر بہ سبب ہمت
جرأت - استقلال - اور حوصلے کے بن گئے ہیں وہ بادشاہ ترکی اور ایران
کے + پس شرم بہت واسطے مسلمان امرائے ہند کے ہو جیوے - کہ مزاج
اُن کا مانند مُنی جان آگرہ والی کے ہو گیا ہے سبب سے کثرت عیش پسندی
اور آرام طلبی کے - بھی نہیں ہوتی ہمت اندر اور بیچ دل ہندوستانی
طلبہ کے - کہ ایم سے پاس کریں وہ علوم دیں اپنے - مگر آے

بے حد بے حیا ہوتے ہیں طلبا ہمارے۔ اور وقت اپنا بال سنوارنے ہاکی اور
فٹ بال کھیلنے میں کرتے ہیں ضائع - اَے صرف +
پس قسم ہے کثرت انگریزی سیگریٹوں کی کہ نہیں سکتے ہیں - اور البتہ
تحقیق نہیں سکتے ہیں کرنا ترقی کا ہندوستانی - کیونکہ جب سفر کرتے ہیں
ہندوستانی سپاہی بیچ ریلوں ہندوستان کے - تو نہیں جگہ دیتے برابر اپنے
ہندوستانی مسافروں کو - مگر جب آجاتا ہے مبلغ ایک انگریز سامنے اُن کے
تو کانپ جاتے ہیں وہ مانند کانپ جانے گائے اور بکری کے - پس لعنت
بہت اوپر ایسے سپاہیوں کے ہو جیو کہ تنگ کرتے ہیں وہ قومی بھائیوں
اور قومی مسافروں اپنے کے کو بیچ ریل کے - بھی یہ ہے سبب اس کا کہ
بیچ اس زمانے ہذا کے نہیں کرتے شادی لڑکی اپنی کی مسلمان ساتھ غریب
آدمی کے موافق حکم شریعت کے - مگر دولتمند ڈھونڈھتے ہیں وہ شوہر لڑکی
اپنی کا - بھی اکثر نوجوان لڑکے سبب سے کثرت مطالعہ ناولوں کے بھاگ
جاتے ہیں ہمراہ تھیٹروں کے شہر اپنے سے - بھی اگر بے پردہ ہی کرنا ہے
تم کو عورتوں اپنی کو تو پہلے بے پردہ کرو تم ایسی بوڑھی عورتوں اپنی کو کہ
ہوں وہ تعلیم یافتہ علوم مذہب اپنے کی - مگر بے پردہ کرتے ہو تم اُن
نوٹڑیوں اپنی کو - کہ نہیں ہیں وہ واقف آداب مذہبی اپنے کے سے -
پس اگر کیا تم نے ایسا - تو وفات تمہاری ہمراہ وفات بہ ہو حلال خور
کے ہوگی - اگرچہ بہت دن گزرے کہ شہرت مسٹر لائیڈ جارج شاگرد قدیم
ہمارے کی مٹ گئی دنیا تمام سے - اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں بیچ
انگلستان کے سر مائیکل اوڈوائر گورنر پنجاب کے - مانند تاریک خیال ملاؤں
مساجد ہند کے - جو نہیں جانتے وعظ کہنا اور تقریر کرنا موافق اس زمانے
کے بیچ دن جمعہ کے - اور جو یہ ہندوستانی افسر لوگ اکثر کر بات کرتے
ہیں ساتھ ہندوستانی ماتحت لوگوں کے - تو یہ سب کچھ نتیجہ ہے بے خبری

کا علوم دینی سے اور غلامی کا۔ ورنہ موافق آداب مذہب کے حد سے زیادہ
خلیق مہربان اور تواضع کرنے والا ہونا چاہیئے۔ ہر ہندوستانی افسر کو مانند
ہم حضور ملّا رموزی صاحب کے۔ مگر جب کہ زوال ہو جاتا ہے یا انسپکٹر ہو
جاتا ہے مبلغ ایک لاغر ہندوستانی تو بعد دنوں چند کے اکڑ جاتی ہے گردن
غرور اُس کے کی۔ اگرچہ میوہ چُراتے ہیں ریلے گارڈ لوگ بریک سے وقت
چلنے ریل کے۔ اور نہیں ریل کھڑی کرتے بہ واسطے ہندوستانی مسافر کے۔
مگر وقت آنے مبلغ ایک یورپین کے۔ لال جھنڈی ہلاتا ہے ہر گارڈ واسطے
روکنے ریل کے +

پس اگر ہو تم شک کے کرنے والے بیچ باتوں ہماری کے۔ تو مثال ہارو
تو مبلغ ایک ایسی کہ غلط ہو جائیں باتیں ہماری۔ کیونکہ اوپر اسی جگہ کے
کہا ہے حکیموں چند نے مبلغ ایک قطعہ کہ یہ ہے وہ قطعہ ہذا

قطعہ سہ کیا نہ دیکھا تو نے اے لڑکے نیک بخت بیچ ایران کے"
کہ ڈانٹا علماء ایران نے تو پر وہ کیا مکہ افغان نے بیچ طہران کے"
پس ایسے ہی اگر متفق ہو جائیں علماء مشائخ، صوفیا، اپنے"
اور اصلاح کریں وہ ساتھ روشن خیالی کے۔ تو ترقی کر جائیں مسلمان
ہندوستان کے"

پس کس قدر صحیح اشعار ہے ہیں ہم نے بیچ اس قطعہ کے + پس
گر زندہ ہوتے بادشاہ محمود غزنوی، یا اکبر بادشاہ، یا حضرت خان خانان
تو دیتے ہم ملّا رموزی صاحب کو ایک ایک لاکھ روپیہ اوپر ایک ایک
سطر مضمون ہمارے کے۔ مگر اب خون جگر پیتے ہیں ہم اوپر ہر سطر
مضمون اپنے کے۔ پس رحمت خدا کی بہت اوپر ارواح ان علم کے
قدردانوں گزرے ہوئے کے ہو جیوٹ۔ کہ نام ان کا زندہ رہیگا بیچ دنیا کے
قیامت تک۔ سبب سے انعام دینے فردوسی اور عرفی کے کثیر + اور

صبر دے۔ اللہ ہم ملّا رموزی صاحب کو بیچ اس زمانے موٹر پرور اور ٹھیٹر نواز کے۔ کیوں کہ آیا ہے بیچ کتابوں مقدس کے یہ کہ شراب اور کباب اڑاتے ہیں وہ کہ دماغ ان کا ہوتا ہے خالی عقل و علم سے۔ اور خون جگر پیتے ہیں وہ کہ دماغ اُن کا ہوتا ہے روشن ساتھ علم و عقل کے۔ کہ کہا ہے ؎ اب کیا کیا بربادیاں اہل قلم ہندوستانیوں کی جھٹلاؤ گے؟

اما بعد۔ اب درود اور سلام بھیجو تم اے مسلمانو اوپر نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ کہ تعلیم دی ہے آپ نے ہم کو صبر۔ جفاکشی، محنت، اور عبادت الٰہی کی + بھی رحمت خدا کی اوپر آپ کے اور اوپر اولاد و اصحاب اور دوستوں تمام آپ کے ہو جیو۔ بھی کچھ اوپر ہمارے۔

ہرگز نہیں مٹیگا نام ہمارا کہ روشن ہے دل ہمارا علم و صبر سے
لکھا ہوا ہے اوپر جریدۂ عالم کے کہ تھے ہم بلند حوصلہ مصلح اور

ملّا رموزی

۲۴۔ ذی الحجہ ۱۳۴۶ھ قدسی ۱۴۔ جون ۱۹۲۸ء

Taj Tahir Foundation

Taj Tahir Foundation

زکات

سنہ ۱۹۱۴ء میں جنگ یورپ کی خبروں کی اشاعت سے مالی فائدہ اُٹھانے کے لئے زبان اُردو کے بے شمار اخبارات جاری ہوئے چونکہ ان نئے اخباروں کا صحیح مقصد پیسہ کمانا تھا۔ نہ کہ عوام کی اصلاح و فلاح۔ اِس لئے اِن اخباروں میں اخباری اصول و ضوابط کا کامل فقدان رہا۔ مثلاً ایسے اخباروں کے ایڈیٹروں کا زیادہ حصّہ۔ "نیم تعلیم یافتہ نوجوانوں" پر مشتمل تھا۔ جو اصول رہنمائی سے خود بے خبر تھے۔ اور اِسی لئے ان کی اخبار نویسی سے بجائے اصلاح کے عوام کا ذوق تباہ ہوگیا۔ مگر اس نوجوان اخبار نویس جماعت نے اس کمزوری کو عوام کے سَر یہ کہہ کر تھوپ دیا۔ کہ "عوام ہند بد مذاق ہیں"۔ حالانکہ عوام کی بد مذاقی کی اصلاح ہمیشہ اخبار نویس کے ذمہ عاید ہوتی ہے +

اخبارات اُردو زیادہ تعداد میں چونکہ نا اہل لوگوں کے ہاتھ

ہیں رہے - اور اُن کی تحریر پر حکومت نے سوائے اپنی حکومتی مصالح کے کوئی اخلاقی احتساب و سزا عاید نہ کی - اِس لئے اُن کی اخلاقی بے رہروی کے مضر اثرات قوم کے ہر حصّہ زندگی پر پڑے - اور قوم کی اجتماعی زندگی کبھی ایک مرکز یا مقصد کے تابع نہ ہوئی - اور یہی وہ عظیم الشان خسارہ ہے جو اخبارات سے قوم کو پہنچا ٭

اخبارات و رسائل میں نااہل لوگوں کے کام کرنے کا یہ ثبوت بھی ہے - کہ غلط تصنیفات و تراجم کی اشاعت سے زبان اُردو میں اغلاط اور گندہ الفاظ و خیالات کا ایک گھناؤنا ذخیرہ جمع ہوگیا - اور یہ اِس طرح کہ اخبارات کی جدید کتاب پر تعارف و تبصرہ لکھتے وقت اُس کی صرف تعریف و ثنا کرتے ہیں اور محض جھوٹ بول کر اُس کی کمزوریوں کو چھپاتے ہیں - اور اُسے مصنّف کتاب کے ساتھ "اخلاقی احسان" ثابت کرتے ہیں - پس تنقید و تعارف کے اِس جھوٹے اور سراسر غلط عمل سے کم علم ارباب قلم نے حوصلہ پایا اور اِس طرح زبان اردو میں ایسا مہمل ذخیرہ آگیا - جس کے مطالعہ سے قوم کا مالی - ذوقی اور ذہنی نقصان ہے ٭

اب جو کبھی زبان اُردو دنیا کی طاقتور یا علمی زبانوں کے برابر ترقّی کر گئی - تو اس ذخیرہ کے دُور یا پاک کرتے وقت اس وقت کی نسل ہمیں بُرائی سے یاد کریگی - اِس لئے ضرورت ہے - کہ اخبارات اور رسائل نہایت ایمانداری اور جرأت سے ہر نئے اخبار یا کتاب کی کمزوریوں کو واضح کر دیا کریں - تاکہ ان کی اصلاح بھی ہو جائے اور قوم اُس کے غلط اثر سے محفوظ رہے ✣

ہندوستانی مسلمانوں نے اسلامی علوم کو روزی کمانے کے لئے ترک کر کے مغربی قوموں کے علوم کو حاصل تو کیا - مگر اِس طرح انہوں نے اپنی "قومیّت" کو بہت بھاری نقصان بھی پہنچایا یعنی غیر قومی تعلیم سے ان کی اخلاقی اور ذہنی استعداد ایک طرح سے اُلٹ گئی یا اوندھی ہو گئی - لہذا وہ ہر ایسی حرکت کو جو اسلامی قومیّت کے قاعدے سے غلط ہو نہایت درجہ صحیح اور مفید سمجھنے کے خوگر ہو گئے ہیں - مثلاً اُنہوں نے اس تعلیم کے اثر سے اپنا قومی لباس ترک کر دیا - اور قومی لباس کا فقدان اصل میں قومیّت کا فقدان ہے + پس ضرورت ہے کہ مسلمانانِ ہند اپنا کوئی ایسا قومی لباس وضع کریں جس میں یکسانیت اور وحدت ہو - ان بل بے جوڑ لباس بھی قومیّتِ متحدہ کے لئے نقصان رساں ہے ✣

حصولِ آزادی کی کوشش میں وہ جماعت کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی جس کے ۹۵ فیصدی افراد لفظ آزادی کے معانی اور مطالب سے بے خبر ہوں ٭

جس جماعت میں لڑکے اور لڑکی کی شادیاں زیادہ عمر میں کی جائیں اُس جماعت کی تباہی یقینی امر ہے ٭

طاقتور جماعت یا قوم اُسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب نوجوانوں کے اخلاق کو طاقتور بنایا جائے اور اخلاق کی حفاظت کا بہترین ذریعہ ابتدائے شباب کی شادی بھی ہے ٭

دنیا کی عظیم الشان لڑائیوں کے حالات اور عظیم الشان لوگوں کی سوانح عمریاں رات دن مطالعہ میں رکھنے سے انسان مصائب اور مشکلات کے وقت بہادر ہو جاتا ہے ٭

محض خیالی اور جذباتی ناولوں ۔ فسانوں اور اشعار کے مطالعہ میں جو وقت صرف ہو اُسے صنعت یا ایجاد و اختراع میں صرف کرنا زیادہ مفید ہے ٭

RajTahirFoundation

غیر قوموں کے تمدنی اور معاشرتی اثرات کو قبول نہ کرنا ایک ایسی فتح ہے جو میدانِ جنگ کی فتوحات سے افضل و اعلےٰ ہے +

تحریر میں غلط الفاظ۔ غلط تراکیب اور غلط جملوں کو لکھ کر یہ کہنا کہ غلط العام فصیح۔ علمی کمزوری ہے + ارباب علم کی شان "غلط العام" کی تقلید سے ذلیل ہوتی ہے +

کسی غلط تحریر کو اس لئے صحیح ثابت کرنا۔ کہ اسی طرح فلاں استاد نے بھی لکھا ہے۔ استناد کا نہایت شرمناک طریقہ ہے۔ کیونکہ غلطی ہر حال میں غلطی ہی رہیگی چاہے وہ کسی فرشتے ہی سے سرزد کیوں نہ ہوئی ہو +

صحتِ زبان یا اصلاحِ زبان کے لئے سند یا استناد کا جو طریقہ آج تک جاری رہا وہ یہ ہے کہ ہر دلیل اور مثال اردو کے حصّۂ نظم سے پیش کی جاتی ہے۔ لیکن اب اردو کے حصّۂ نثر سے بھی استناد کی ضرورت ہے۔ اس سے اصلاح زبان میں آسانی ہوگی + گو یہ رسم کے خلاف ہے۔ مگر مفید بدعت بھی کبھی کبھی جائز ہوا کرتی ہے +

Taj Tahir Foundation
Taj Taim

شاعر اور نثر نگار کو ہمیشہ اپنے زمانے کے محاورات یا مصطلحات روزمرّہ اور بول چال کو لکھنا چاہیئے - اس سے زبان کی ترقّی اور وسعت کا ہر دور متعیّن ہو سکتا ہے - یہ طریقہ نہایت لغو اور غلط ہے - کہ ۱۹۲۹ء کا شاعر یا نثر نگار ..... دلی دکنی یا میر امّن دہلوی کی تحریروں سے اصلاح لے - پس استناد یا سند کے لئے بھی اپنے ہی دور کے شعراء اور مستند اُدباء موزون ہیں ٭

جس مُلک میں کثیر المقاصد انجمنیں بکثرت ہوں - اس امر کی علامت ہے کہ اُس مُلک کے باشندوں میں وحدتِ خیال نہیں - اور جن باشندوں میں وحدتِ خیال نہ ہو - اُن میں وحدتِ عمل بھی نہیں - اور جن لوگوں میں وحدتِ عمل نہ ہو اُن کی قومی موت یقینی ہے ٭

جو قوم کسی دوسری قوم کے اخلاقی - تمدنی - معاشرتی - اور فکری آثار و اثرات کو شدت سے پسند کرتی ہو وہ اُس کی غلامی کو باعثِ عار نہ سمجھیگی ٭

جس قوم کے بچّے ابتدائی عمر سے ناز و نعم میں پلے ہوں اُس

Taj Tabir Foundation

کے جوانوں میں عیش پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوگی - اور جب نوجوانوں میں عیش پسندی ہوگی - تو اُن میں بے حیائی اور بے غیرتی یقینی ہوگی - اور جب بے غیرتی پیدا ہو جاتی ہے - تو انسان اپنے خاندان - اپنے ملک اور اپنی قوم کی عزّت و ناموس کی حفاظت سے عاری ہو جاتا ہے +

جن خاندانوں میں نوکر اور خدمتگار معتمد یا منصرم بنا دیئے جائیں سمجھو کہ اس خاندان میں بے حیائی اور بے غیرتی اب پھوٹ پڑیگی - اور اس خاندان کا ایک ایک فرد بے حمیّت اور بے غیرت ہے + دولتمندوں میں یہ وبا عام ہے +

جو شخص کسی ادنےٰ بے غیرتی کو پسند یا گوارا کر سکتا ہے - وہ وقت آنے پر بڑی سے بڑی بے حیائی کو بھی برداشت کر سکتا ہے +

حسّاس اور ذی ہوش آدمی کی صحت ہمیشہ خراب اور قویٰ مضمحل رہتے ہیں اور بیوقوف - بدعقل اور بے دماغ آدمی ادنےٰ سی فارغ البالی سے بے حد و بے قیاس توانائی اور فربہی کا مالک بن جاتا ہے +

وطن ایک ایسی محدود سرزمین کو کہتے ہیں - جہاں آدمی ہنرمند ہو کر بے ہنر ہو جاتا ہے اِس لئے ہنرمند وہی ہے - جو اِس ذلیل سرزمین کو ٹھکرا کر خدا کی پھیلی ہوئی سرزمین کے جس حصّے میں عزّت پائے - چلا جائے ٭

دوست کے معنی ہیں ایک فریب دینے والا انسان - جو اپنی اغراض کی تکمیل کے لئے ہمارے ساتھ ہے - مگر ہم اپنی بیوقوفی سے اُسے پہچانتے نہیں ٭

صحت کی حفاظت وُہی شخص کر سکتا ہے - جو بیماری کے خطرات سے ڈرتا ہو - اور ہولناک بیماریوں میں وُہی شخص مبتلا ہوتا ہے - جو بیماری سے نہیں ڈرتا ٭

جو شخص کہ اوقات کا پابند نہ ہو - سمجھو کہ یہ ہندوستانی ہے ٭

جو شخص ریل میں سوار ہوتے وقت پریشان اور بدحواس نظر آئے سمجھو کہ یہ ہندوستانی ہے ٭

جو شخص پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ پر قابو سے باہر نظر آئے - سمجھو کہ یہ ہندوستانی افسر ہے ٭

Taj Tahir Foundation

اکثر احباب کو شکایت ہے کہ ہمارے مخصوص طرزِ تحریر "گلابی اردو" میں اب وہ پہلی سی شگفتگی باقی نہیں رہی۔ اُن کا یہ خیال بالکل صحیح ہے۔ مگر ایسا قصداً کیا گیا + وجہ یہ ہے کہ "گلابی اُردو" کی جانِ شگفتگی اصل میں وہ سیاسی تنقید و نکتہ چینی ہُوا کرتی تھی۔ جو اس وقت اس تحریر کا حقیقی نصب العین تھی۔ مگر یہ نصب العین تابع تھا مسلمانانِ ہند کے اُس عظیم الشان اور متفقہ مقصد کا۔ جو منصبِ خلافت کے حفظ و بقا کے لئے آٹھ کروڑ مسلمانانِ ہند نے طے کیا تھا +

میں بقائے خلافت کی جنگ میں اِس لئے شریک ہوا تھا کہ اپنے قلم کی بہترین قوتوں کو اس جنگ کے مجاہد سپاہیوں کی کمانڈ میں خرچ کرونگا۔ اور اِسی لئے گلابی اردو میں ۱۹۲۱ء تک جو ولولہ انگیز شوخیاں پائی گئیں وہ اصل میں انہی خلافتی لشکروں کی تازگی اور حوصلہ افزائی کے لئے تھیں +

لیکن جب ۲۲ء میں ہماری بدنصیبی سے تختِ خلافت کو ترکی مسلمانوں نے اُلٹا دیا۔ اور مسلمانوں کا کوئی مرکز نہ رہا۔ تو گلابی اردو لکھنے والا قلم جس حسرت و افسردگی سے رکھ دیا گیا۔ اُسے کچھ دل ہی خوب جانتا ہے! اور واقعی

آج جو قلم گلابی اُردو بطرزِ یادگار لکھ رہا ہے - یہ وُہ قلم نہیں جس سے کبھی جوشِ خدمت اور ولولہ انگیزی کی چنگاریاں بلند ہوا کرتی تھیں +

ظاہر ہے کہ اجتماعی عمل ہمیشہ عام حالات و ضروریات کا تابع ہُوا کرتا ہے - چونکہ اب مسلمانانِ ہند کے سامنے کوئی متفقہ مقصد نہیں رہا - بلکہ اُن کے اندر وہی انتشار اور برہمی پھوٹ پڑی - جو میدانِ جنگ کی پسپا شدہ افواج میں لازمی طور پر پھوٹ پڑتی ہے - اِس لئے ہم نے بھی اپنے قلم کو اُن کی داخلی اصلاح و تنظیم کی طرف پھیر دیا - اور داخلی اصلاح تنظیم سے ہماری مراد مسلمانانِ ہند کے اخلاق کی اصلاح و حفاظت ہے + اور ظاہر ہے کہ اگر کسی فوج کی اخلاقی حالت درست ہو جائے - تو یہ اُس سے بہتر ہے کہ وہ میدانِ جنگ میں کوئی وقتی اور ہنگامی فتح حاصل کر کے اخلاقی بد نظمی کی وجہ سے دوبارہ شکست کھا جائے +

چند روز سے خدا جانے یہ خطرہ کیوں لاحق ہو رہا ہے - کہ ہم مرنے والے ہیں - یا مر جائینگے - یا مر کر رہینگے - یا مرنا ہی پڑیگا - مرنا تو ہے - یا مر گئے تو؟ اِس لئے دوسرا خطرہ یہ

پیدا ہو جاتا ہے - کہ پھر ہماری صحیح سوانح عمری کون لکھیگا؟ ہماری یاد میں ہمارا مجسمہ کون قائم کریگا؟ ہمارے عُرس کا انتظام کون کریگا؟ ہمارے جانشینوں کو حیدر آباد سے وظیفہ کون دلائیگا؟ جبکہ ہماری زندگی ہی میں حیدر آباد سے حج بیت اللہ شریف تک کے دام نہ ملے ٭

پھر یہ خطرہ پیدا ہوتا ہے - کہ اگر اسی کس مپرسی کی حالت میں ہم مر گئے اِنّا لِلّٰہ - تو پھر مؤرخین اور سوانح نگاروں کا ایک گروہ لکھ دیگا - کہ مُلّا موزی صاحب کی عمر تو تھی ساٹھ ستّر برس کی - پیشہ تھا ملازمت - وطن تھا شیراز - بیعت کی تھی خواجہ حسن نظامی سے - اور قوم کے تھے - کے - کے - زئی لاحول ولا +

دوسرا گروہ لکھ دیگا - کہ اپنی تصنیفات میں مُلّا موزی صاحب طلسم ہوشربا - اور بغداوی قاعدہ چھوڑ گئے ہیں - خدا اپنے جوار رحمت میں جگہ دے + تیسرا گروہ لکھ دیگا مہاراجہ صاحب محمود آباد سے پانچ سو روپیہ ماہوار وظیفہ تعلیمی پاتے تھے - خدا پسماندوں کو بجائے تنخواہ کے صبر جمیل عطا فرمائے + چوتھا گروہ لکھ دیگا وہ نہایت خوش حال و فارغ البال تھے - بمبئی میں کئی اصطبل اور کوٹھیاں چھوڑ گئے ہیں + پانچواں گروہ انتہائی عزت افزائی کریگا - تو لکھ دیگا - کہ ؎

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں، استغفراللہ +

اِس لئے اپنے متعلق خود ہی چند نہایت معتبر اطلاعات قلمبند کئے جاتے ہیں - پس مورخین اور سوانح نگاروں کو چاہیئے کہ وہ ہمارے بعد ہماری سوانح عمری یوں لکھیں - کہ حضرت مُلّا رموزی نے جس وقت یہ تحریر لکھی اُس وقت تک اُن کے ساتھ اخبارات اور رسائل کا برتاؤ یوں تھا کہ اُن سے ہر اخبار اور ہر رسالہ مضمون طلب کرتا تھا - مگر مفت اور بے معاوضہ۔ اور وہ ہزاران ہزار مشکلات و مصائب کے باوجود انہیں جب اپنے خونِ جگر سے لکھ کر کوئی مضمون دیتے تھے - تو یہ اخبار اور رسالے اُسے بغیر کسی حوصلہ افزا اور تعریفی نوٹ کے اس بے اعتنائی اور بیدار کے ساتھ چھاپ دیتے تھے - گویا وہ کوئی خطاب لاجواب کا اشتہار ہے - جس پر ایڈیٹر کوئی عبارت اپنی طرف سے بڑھا نہیں سکتا - لیکن یہی اخبار اور رسالے جب سَر ڈاکٹر محمد اقبال کا کوئی شعر یا نظم چھاپتے تھے - تو اُن کی تعریف میں ہزاروں فقرے اپنی طرف سے لکھتے تھے - حالانکہ دونو اپنے اپنے فن کے لحاظ سے یکتائے روزگار تھے - صرف مالی اعتبار سے مُلّا رموزی صاحب غریب تھے - اور اقبال صاحب امیر اور دونو کے کمال کا یہ وہ اعتبار تھا - جسے خود صحافت

اُردو نے تسلیم کر لیا تھا + پس کیا ایسی صحافت دنیا میں ترقی کی اُمید رکھ سکتی ہے؟ استغفر اللہ!

مُلّا رمضانی صاحب چاہتے تھے۔ کہ اُنہیں رہنے کو ایک شاندار کوٹھی ملے جس میں باغ بھی ہو اور بجلی کے پنکھے اور روشنی بھی + اُن کی خدمت میں خدام بھی ہوں اور سواری کو موٹر بھی۔ وہ کسی کے ملازم بھی نہ ہوں اور نہ کسی کے قرضدار بھی۔ انہیں نہ فکرِ معاش ہو نہ پروائے اقارب بھی۔ وہ چاہتا سلک کپڑے کے سوٹ بھی استعمال کریں اور ٹاسن کا پمپ بھی۔ وہ یورپ کی سیاحت بھی کریں اور تمغے شریف کا جج بھی۔ اُن کی جیب میں ہر وقت نوٹ بھی رہیں اور سیگریٹ کیس بھی + پھر وہ اس قدر فراغت اور خوشحالی کے بعد جب چاہیں کچھ لکھیں اور جب چاہیں موٹر میں سوار ہو کر تفریح کو چلے جائیں۔ کیونکہ وہ ان سب اوپر کی چیزوں کے استعمال اور راحت سے واقف تھے۔ لہذا ان کو ان میں سے جب ایک چیز بھی حاصل نہ ہوئی تو انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا۔ کہ جو شخص اپنی محبوب تریں خواہش کو پامال کرنے کا عادی ہو جائے۔ کامیابی اُسی کی غلام ہو گی ٭

اس وقت تک یعنی "تا دمِ تحریرِ ہذا" اُن کی عمر تھی نو اوپر بیس ۲۹ برس کی۔ قوم کے تھے سیّد افغانی۔ مذہب تھا اسلام۔ مقلد تھے حضور امام ابو حنیفہ رحمت اللہ علیہ کے۔ حافظ قرآن تھے اور مولوی صاحب بھی + وطن کا پتہ آج تک نہ چلا۔ صرف افغانی قوم اُن کی ذات پر فخر کر سکتی ہے + تعلیم و تربیت کی تکمیل ہوئی تھی۔ کانپور۔ لکھنؤ اور علی گڑھ کے قریب ایک قصبہ میں اِس لئے کچھ آدمیت پیدا ہو گئی تھی۔ جسم کے تھے دُبلے پتلے۔ مزاج کے بے انتہا غیر معتدل۔ غصّہ کے تیز۔ حق گو۔ خوشامد پسند اور لالچی۔ مقصد کے حصول کے لئے مستقل مزاج اور بے مقصد کسی کے شریک نہیں۔ غرض خدا رکھے اور عمر دراز کرے اپنے مُلّا رموزی صاحب کی۔ کہ کہا ہے ؎

نیکوتر آن باشد کہ سر دلبران
گفتہ آید در حدیثِ دیگران

مُلّا رموزی بقلم خود

قانونی زندگی

انسانوں کی گرفت - بازپرس - پرسش - رسوائی - ڈر - خوف - ہراس - وحشت - گھبراہٹ - اضطراب - بےچینی - طیرہ - اندیشہ - دھمکی - سزا - ڈانٹ ڈپٹ - تخویف - ماربیٹ - قید - بندش - نگرانی اور تعطل کے کاغذی ذریعہ کو اگر "قانون" کہا جائے یا کہتے ہیں - یا کہا ہے - یا کہنا چاہیئے - یا کہا گیا ہے یا کہینگے یا کہا جائیگا یا کہو - تو پھر شبہ - نوٹس - سمن - وارنٹ - گالی گلوچ - دھول دھپا - گھونسہ - بید - لاٹھی - ہوائی فیر - گرفتاری - ہتکڑی - بیڑی - حاضر - تلاشی - حوالات - رسیلی روٹی - چھپکا سلاخ - بغیر روشنی کا کمرہ مع مچھر بچھو سانپ - چالان - پیشی پر پیشی - اثبات دعوے - جواب دعوے - وکالتاً یا اصالتاً - پیروی - جواب دہی - تحریری بیان جواب دینے سے انکار - ضمانت - فرد جرم - عینی گواہ - صرفہ خوراک - اقرار صالح - جرح - تنقیحات فیصلہ - ایکا - درجن - پیادہ - جرمانہ - بصورت عدم ادائے جرمانہ - قید محض - قید بامشقت - کال کوٹھری - مونچھ بٹوانا - بحالت بیڑی - کھدر کی قمیص - بحالت تمام جیل - تختی نمبر فلاں در گلو - چکی چلانا اس حالت میں کہ قیدی کا تخلص حسرت موہانی

ہو۔ حبس دوام بعبور دریائے شور اس شرط پر کہ مجرم علاقہ بنگال
کا فرد ہو۔ قصاص۔ پھانسی۔ اور سزائے جس کو حکومت کہ ضرر پہنچائے
یہ سب لوازم قانون یا اثرات قانون کہلائینگے یا کہے جاتے ہیں +
لیکن اگر ہم سے کوئی "قانون" کی تعریف دریافت کرے
تو ہم بے علم سے میلان خواں لوگوں کی طرح بجائے کسی نفس
اور بلا غشہ کے قانون کو اس عملی مثال سے سمجھا دینگے۔ کہ
دو گھوڑے کی وہ لگام جس کے ذریعہ گھوڑے کو یا گھوڑے پر
بیٹھنے والے کو راستہ پر ایسا سیدھا چلایا جاتا ہے جو خطرہ اور
نقصان سے محفوظ رہے۔ اور گھوڑے کی دوڑ یا چال یا رفتار
کسی کے لئے اگر مفید نہ ہو تو مضر بھی نہ ہو + اب اگر یہ
کہیں کہ قانون ان افلاطونی اصول کے مجموعہ کو کہتے ہیں۔
جن کے ذریعے کبھی کبھی مجرم بھی بلا اخذ جواب رہا ہو کر بھی
کے حق میں الٹا ازالہ حیثیت عرفی بن جاتا ہے۔ تو ہم کہینگے
کہ پھر تو افلاطون بھی ذرا جے دقوف تھا۔ کیونکہ قانون کی یہ
تعریف تو یہ ہو سکتی ہے کہ۔

ایسا طریقہ جس سے انسان آزاد رہ کر بھی نقصان نہ پہنچا
سکے اور نہ نقصان پائے۔

اب اس تعریف پر اگر کچھ اضافہ ہو سکتا ہے تو وہ صرف
لفظ "ہرگاہ" کا کیونکہ اصطلاحاً ہر دو فقرہ اور ہر وہ عبارت

قانون سمجھی جائیگی - یا قانون کا اثر پیدا کرکے چھوڑیگی - جس کے سرسری پر یا شہر دیوع میں لفظ "ہرگاہ" ہو - اور بقیہ عبارت اس قدر پیچیدہ اور گنجلک ہو کہ اپنے بڑے مولوی صاحب بھی اس کا مفہوم نہ سمجھ سکیں +

وکیلوں کے خیال میں "قانون" وہ ہے جس سے موکل یا موکلہ تابع ہو یا بغیر بیشی نصف مختانہ ادا کردے یا ادا کرنے کا وعدہ کرے - یا ادا کرنے کی اہلیت رکھتا ہو یا رکھتی ہو - یا بصورت جیتنے جائیداد متنازعہ کے دس روپے علاوہ مختانہ کے "مٹھائی" کے نام سے ان کے بچوں کے ہاتھ پر رکھ دے - یا ان کے منشی کو دے دے +

ان تعریفات کے بعد ہمارے نزدیک قانون کہتے ہیں اس قوت کو جو انسان کے اندر دوسرے قوتوں کی طرح موجود ہے - اور جو اس کی جملہ قوتوں پر احتساب و نگرانی کرتی ہے + یہ قوت انسان کو غلط کاری اور غلط روی پیدا کرنے کے ہر مضرت سے محفوظ رکھتی ہے - اس قوت کا بقاء منحصر ہے انسان کی اچھی صحت اور بہترین ماحول پر - اگر انسان کی صحت نہایت درجہ معتدل اور صحیح ہو - لیکن وہ جرائم پیشہ طبقہ میں رہے یا رکھا جائے تو اس کی قانونی قوت بیکار یا مضمحل ہو جاتی ہے لیکن اگر وہ ایسے ماحول میں رہتا ہے یا رہتی ہے جہاں سب

یا اکثر لوگ "قانونی زندگی" کے خوگر ہیں - تو وہ ہر قسم کی غلط کاری یا غلط روی سے محفوظ رہ کر صحیح معنی کا انسان بن سکتا ہے + قانونی زندگی والے کی پہچان یہ ہے کہ وہ سوسائٹی یا قوم کی متفقہ یا مروجہ طرز زندگی سے ایک بالشت - ایک انچہ - ایک ہاتھ - ایک گز - ایک سوت - یا ایک کلومیٹر بھی پیچھے نہ رہے اور نہ آگے بڑھے - اور اسی لئے یہ واضعین قانون انسانی نے جو اصول و ضوابط انسانی زندگی کو منتظم اور محفوظ رکھنے کے لئے وضع کئے ہیں وہ سراسر انسان کو وحشت اور درندگی سے پاک کر کے پر امن اور سلیقہ مند - منتظم اور نفع بخش بنانے والے ہیں + یہاں آپ واضعین قانون سے کہیں - مسٹر دی - جے - پٹیل اور تمر ملک عمر حیات خاں لوٹانہ کو نہ سمجھ لیجئے - بلکہ وہ مافوق الفطرت انسان مراد ہیں - جنہوں نے انسان کے پر امن رہنے سہنے کے طریقے وضع کئے ہیں +

لیکن دیکھنا یہ ہے - کہ یہ قوت آج ہمارے ملک کے افراد میں کہاں تک باقی ہے - اور جو نہیں ہے تو کیوں ؟ مگر اس کے لئے پہلے ان افراد انسانی کی قانونی زندگی پر ایک نظر ڈالنا ہوگی - جو صحیح معنی میں یا بڑی حد تک ہی قانونی زندگی کے دائرے میں آتے ہیں + اس لئے لامحالہ ہم کو یہی سامنے والے لوگ عرف انگریزوں کی زندگی کو مثال بنانا پڑے گا - مثلاً آپ ایک انگریز

کو لیجئے اور دیکھئے کہ وہ صبح اذان کے وقت نیند سے بیدار ہوگا۔
اور ہو کر رہیگا۔ پھر وہ صبح کی میونسپل کمیٹی کے اجلاس سے فارغ
ہو کر غسل کر لیگا۔ یا منہ ہاتھ دھو لیگا۔ یا کلی کر لیگا۔ یا ناک میں
پانی نہ ڈالیگا تو سر کے بالوں کو سنوار لیگا۔ یا مسواک نہ کر لیگا تو
برش سے دانت صاف کر لیگا اور صاف کر کے رہیگا۔ ورنہ چائے
سے تو کسی حال میں نہ چوکیگا + پھر وہ اخبار پڑھیگا۔ یا خط وط
لکھیگا + پھر وہ سکول جائیگا۔ یا دفتر یا دوکان پر یا کھیت پر
یا پریس پر یا روئی کے کارخانے میں یا اسٹیشن پر یا جہاز پر یا
کسی کارخانے میں کام سیکھیگا + بہرحال وہ کہیں جا کر رہیگا
پھر وہ دوپہر سے ذرا ہٹ کر کھانا کھائیگا۔ جاہے اس
وقت اس کے سامنے کسی ہندوستانی کی پھانسی کا مقدمہ ہی
کیوں نہ پیش ہو + پھر وہ گھر آئیگا اور یہاں غسل کر کے پھر
چائے یا بسکٹ یا سیب اور انگور کھائیگا + پھر وہ اصالتاً یا
کہنے کے ساتھ سیٹی بجاتا ہوا کرکٹ۔ ٹینس یا ٹھنڈی سڑک یا
پارک یا بازار کی تفریح کو جائیگا اور جا کر رہیگا۔ تاکہ ہلکا سا
پسینہ اس کے جسم سے پیدا ہو جائے + پھر وہ مغرب کی اذان
کے بعد گھر آ کر غسل کر لیگا + پھر وہ ٹوسٹ۔ شیمپاگنی۔ ایٹ ہوم
یا عرف اپنے ننھے میاں کی والدہ کے ساتھ کھانا کھائیگا + پھر
کچھ دیر اخبار۔ گپ۔ تاش۔ بلیرڈ۔ قہقہہ۔ شراب۔ عشق و فکر

میں گزار کر پلنگ خفتہ باشد ہو جائیگا - یا ہو جائیگی - اور دوسری صبح پھر وہ گذشتہ سے پیوستہ ہو جائیگا +

یہ ہے انگریزوں کی وہ زندگی جسے قانونی زندگی کہا جاتا ہے یا کہنا چاہیئے + بخلاف اس کے ہندوستانیوں کی زندگی میں قانون کی پابندی یوں نظر آتی ہے - کہ وہ صبح سویرے نہ اٹھتا ہے نہ اٹھیگا - یا کیوں اٹھے ؟ اور کیوں اٹھایا جائے ؟ یا کون اٹھائے ؟ اور کیسے غرض ؟ یا کون اٹھاتا ہے ! اور کس لئے اٹھائے یا اٹھائے تو اس کی جھنجھلاہٹ اور ڈانٹ ڈپٹ کون سنے ؟ اور کیسے ہٹی ! پھر اگر وہ اٹھا بھی تو نصف گھنٹہ تک وہ کروٹیں ہی لیتا رہیگا - یا لیٹا رہیگا + پھر وہ پلنگ پر بیٹھ تو جائیگا مگر اس طرح کہ ابھی اس کی آنکھیں بند ہونگی + پھر وہ اونگھنا شروع کریگا - یہاں تک کہ ایک مرتبہ تو وہ تکیہ پر سر کو رکھ ہی دیگا + وہ پھر اٹھیگا - اور اب وہ کبھی کان پر ہاتھ دھریگا کبھی ناک پر - کبھی آنکھیں ابھی بند ہی رکھیگا + وہ اب پھر لیٹ جانے کی طرف مائل ہو گا - اور لیٹے وہ پھر لیٹ گیا + اب پھر وہ ہوشیار ہو گا - لیکن اسی گرانی کے ساتھ - اور جواب بھی اس کے پلنگ پر وضو نہیں آئی ہے - تو وہ پھر سو جائیگا اور خوگر ہو جائیگا

اب وہ دوپہر آجانے یا غبار ختم ہو جانے کی وجہ سے وہ آنکھیں
تو کھول دیگا - مگر جنبش نہ کر سکیگا - صرف یہ آواز باہر جائیگی
لیگا اس پانی سے بکھرے ہوئے لوگ کو پہچانا ہی ہے
دیکھیگا - اگر قریب تر نظر آگیا تو وہ اپنے ہاتھ یا سنگریزے یا
پھینکے سے کام لیگا اور پھر لوٹا لیکر میں نسیل پر چڑھ جائیگا -
اور وہاں سر کو دونوں ہاتھوں کا سہارا دے کر ایک مرتبہ پھر
سو جانے کی کوشش کریگا - یا اور چیزوں میں مصروف ہو جائیگا -
اور جب یہ کچھ نہیں تو صرف آنکھیں ہی بند کر لیگا - اب شہر
کی نسیل پر لوٹے کے دوسرے تیسرے کی نمائش
یا ڈانٹ ڈپٹ کی باہر آجائیگا اور بقدر ضرورت مشکیزے پانی سے بھر کے
ہاتھ منہ دھو لیگا - گویا تمام دنیا کا غبار اسی سے چہرے کو
خراب کر گیا ہے - اس منہ دھلائی میں بقدر ضرورت خدام کا سہارا
بھی لیا جاتا ہے - واضح ہو کہ ان کاموں میں دس بجے دن تک
کا وقت گزر گیا - اب وہ گھر کے لوگوں سے گپ شپ کریگا -
یا گھر میں آکر ناشتہ کھا لیگا - یا کھانا کھا کر لونڈی پر جائیگا
اور کوئی تین گھنٹہ آرام کر کے وہ پھر لیٹنا چاہنے کی فکر میں
مصروف ہو جائیگا - اور بیشتر وہ دوپہر کو نہیں لیٹا ہی کریگا -
اور اگر وہ کان پر ہوگا تو چاہے گا کہ بغیر غسل کئے واپس چلا
جائیگا - مگر وہ لیٹ کر رہیگا - اس طرح وہ چار بجے دن

یکسا زندہ رہیگا۔ اور اب وہ اس طرح گھر واپس آئیگا۔ گویا چین وجایان کو وہ اکیلا ہی فتح کر کے ابھی ابھی واپس آیا ہے + اس وقت گھر میں اس پہ کام کرنے کی گرانی اس قدر بڑھی ہوئی ہے۔ کہ اپنے کپڑے تک خود نہ اتاریگا۔ اور جو افلاس کی وجہ سے ملازم نہ ہوگا تو خود اتاریگا۔ مگر اس طرح کہ ایک کپڑا بھی اپنی مقررہ جگہ پر نہ رکھیگا + وہ اب کام کر کے آیا ہے اس لئے اس کی ہر بات میں غصہ ہوگا۔ اور گھر والے آپس میں اشاروں سے کہہ دینگے کہ نوکری پر سے آرہے ہیں بات نہ کرو + اب وہ انگریزی کی تقلید میں چلتے چلتے نوش کریگا اور پھر وہ حقہ لیکر مکان کے باہر بیٹھ جائیگا۔ اور تمام دوستوں کو دن بھر دفتر کے واقعات سنائیگا۔ یا پھر وہ تفریح کو جائیگا + اب اگر باغ کی طرف نکل گیا یا ٹھنڈی سڑک پر تو گرانی کا یہ حال ہوگا۔ کہ کوٹ یا شیروانی کے تمام بٹن کھول دیگا۔ اور ٹوپی ہاتھ میں یا بغل میں رکھیگا + قدم اس طرح اٹھائیگا۔ گویا وہ اس سے پہلے کسی ٹانگے کا ٹٹو تھا۔ اور اب اسے ٹانگہ سے کھول کر ٹہلایا جا رہا ہے + واپسی بجائے ٹھیک مغرب کے ٹھیک عشا کے وقت ہوگی۔ اور جو راستہ میں کسی بے تکلف دوست نے کھانا بھی کھلا دیا۔ تو اب دو شب کے بارہ تیرہ بجے ہی گھر واپس آئیگا +

اس مربوط و مسلسل زندگی کے بعد اس کی متفرق قانونی زندگی
یوں ہے کہ جس راستہ سے سپاہی جانے کو منع کریگا - وہ اسی
راستہ سے گزرنے کی کوشش کریگا + اگر سواری میں روشنی لیکر
جانے کا حکم ہوگا - تو وہ بغیر روشنی کے سواری کو سپاہی کے
سامنے سے لیکر گزر جانے کو بڑی زبردست فتح سمجھیگا - اگر دعوت
یا نوکری کا وقت دس بجے ہوگا - تو وہ ہمیشہ گیارہ بجے پہنچیگا - البتہ
ریلوے اسٹیشن پر ٹھیک وقت پر پہنچنے کی جگہ وہ ہمیشہ دو گھنٹے
پہلے پہنچ جائیگا + اگر ریل کے کسی ڈبے میں صرف دس آدمیوں
کی نشست کا قانون ہے - تو یہ اس میں بیس اٹھیس ہو کر
بیٹھیگا - اور مسجدوں میں سیدھی صف بنا کر نماز پڑھنے کا قانون
ہے - تو ہمیشہ ٹیڑھی صف بنا کر نماز پڑھیگا + اگر اسے ایڈیٹر ہو
کر کسی اخبار یا رسالہ کو پابندی سے شائع کرنا ہے تو یہ ہمیشہ
ڈبل نمبر شائع کریگا - اور اعتذار میں صاف لکھ دیگا کہ اب
دیر نہ ہوگی - مگر پھر ہو گی - اگر وہ ریل کے ذریعہ کسی دوسرے
شہر جائیگا - تو ہمیشہ مقررہ دن سے ایک دن بعد پہنچیگا - جب
اسٹیشن پر ایک بھی استقبالی نہ آئے + اگر وہ کرایہ کے مکان میں
رہتا ہے - تو کرایہ ہمیشہ دوسرے مہینہ ادا کریگا - اور جو یہ
ہندوستانی ہوا کہیں کا رئیس اعظم - تب تو اس کی ساری زندگی
میں قانون کا وجود ڈھونڈھے نہ ملیگا - کیونکہ وہ تو

ہے رئیس - اور رئیس کے لئے ویسے بھی قانون - کاغذ کا ایک پرزہ
ہے رئیس - اور رئیس کے لئے ویسے بھی قانون - کاغذ کا ایک پرزہ
ہے - کہ کہا ہے جرمن کے وزیر اعظم نے - خدا کرے اب ان لوگوں
کو سمجھ آ جائے - پھر دیکھنا قانونی پابندیاں - !!!

ہماری رائے "پیر گل" کی بابت

(از رسالہ "نیرنگ خیال" لاہور، جولائی ۱۹۲۲ء)

وہ جو اگلے زمانے میں ہم گلی گھوڑے گئے تھے - تو یہاں کے اسکولوں - کالجوں - اور یونیورسٹی کے تمام طلبہ - ماسٹر - پروفیسر اور خالی جناب نواب سر محمد مزمل اللہ خاں بہادر کے سوا سب کے سب پہلے ہی سے مانے ہوئے بیٹھے تھے کہ حضرت گلی رمضانی نہ فقط ضیاء الملک اور قبلہ اور ظل اللہ الحالی ہی ہیں - بلکہ وہ ایک نہایت اعلیٰ درجہ کے انشا پرداز - فاضل - ادیب - جادو نگار - مقرر - لیکچرر - ایڈیٹر - نقاد اور مدبر بھی ہیں - صرف دار الاکبر آباد کے "شاعر اعظم" نہیں ہیں - اس لئے تمام ایسے خیال کے لڑکے لڑکیاں - نوجوان اور بوڑھے اپنی اپنی کھچی ہوئی کتابیں - مضامین - اور ناولیں وغیرہ لئے بیٹھے تھے - کہ جونہی کہ ان سے ملیں - وہ اپنی ان کتابوں کو تحفہ اور ہدیہ بنا کر ہمیں پیش

کر دیں - چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جو ہم کسی قابل آدمی سے ملے -
اُس نے چٹ اپنی کوئی کتاب ہمیں مرحمت فرما دی - گو کتاب
پیش کرنے والوں کو یہ خبر نہ تھی کہ

"نگار خانہ" کو علمی و ادبی کتابیں پیش کرنا اصل میں پیش
کرنا نہیں - بلکہ اُس پر لاد دینا ہے (سمجھ گئے؟)

پس ایسے ہی بھائیوں میں مسلم یونیورسٹی کے مشہور و معروف
ادیب حضرت مولوی جلیل احمد قدوائی بی - اے بھی ہیں -
جنہوں نے ہمیں اپنی بہترین کتاب "بیرگل" عطا فرمائی -
لیکن جب یہ سب کتابیں ہمارے اوپر لاد دی گئیں - تو
ہم نے بھی اسی نسبت سے بجائے مطالعہ کے انہیں اپنے
اُسی کالے رنگ کے صندوق میں بند کر دیا - جو علی گڑھ
جاتے وقت دہلی کے اسٹیشن سے بغیر ہماری اجازت اور
موجودگی کے سہارنپور تک اکیلا چلا گیا تھا - کہ جب وطن ہی
پہنچ گئے - تو وہ ننھے میاں کی والدہ سے کہینگے کہ لو جی ذرا
تم پڑھتی جاؤ اور ہم ذرا سنتے جائیں +

مگر اس حساب سے یہ خالص علمی ادبی کتابیں "داستان
امیر حمزہ" ہو جاتیں - اس لئے یہ ارادہ ترک کر دیا - ادھر
ویسے بھی "ننھے میاں کی والدہ" کتاب پڑھتے وقت اونگھتی
بہت ہیں - نیز خود کتابیں پیش کرنے والے بھائیوں نے

اپنی کتاب پر صرف اتنا ہی لکھ دیا تھا کہ

"ادیب لبیب حضرت ملّا رموزی کی خدمت عالی میں" یہ

ناچیز ہدیہ فقط بقلم خود مصنف پیش ہے

یہ کہیں نہیں لکھا تھا۔ کہ جناب ملّا رموزی صاحب اس کتاب کو آپ بہت غور سے پڑھنا یا پڑھانا۔ یا سُن لینا یا سُنا دینا۔ جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ جو چاہو سو کرو۔ اس لئے ہم نے بھی علی گڑھ کا قیام معاوضہ کے مضامین لکھنے میں گزار دیا۔

لیکن اب جو علی گڑھ سے وطن کی طرف پسنجر گاڑی میں آئی۔ تو سوچا کہ اس مرتبہ ریل گاڑی میں یہ کتابیں پڑھتے ہوئے جائینگے۔ اس سے ذرا دل لگنے میں مدد بھی مل جائیگی۔ بس یہ سوچ کر اٹھالی مولوی جلیل احمد صاحب قدوائی۔ بی۔ اے کی کتاب "سیمیکل"۔ اور لگے پڑھنے۔

قبل اس کے کہ اس کتاب کے متعلق کچھ عرض کریں۔ اتنا بتائے دیتے ہیں۔ کہ ریل کے سفر میں فائدہ ہے۔ کہ اگر کوئی سخت بیمار ہو تو راستہ آرام سے کٹ جاتا ہے۔ ریل کے ڈبے میں کافی جگہ ہو۔ تو راستہ آرام سے کٹ جاتا ہے۔ ریل کے تین منٹ والے اسٹیشنوں پر ٹھہرنے کا خطرہ نہ ہو۔ تو راستہ آرام سے کٹ جاتا ہے۔ ریل کے ڈبے میں نشست محفوظ ہو۔ تو راستہ آرام سے کٹ

جاتا ہے ٭

مگر یہ سب باتیں اُسی وقت پوری ہو سکتی ہیں - جب ہم خود سفر کریں فرسٹ کلاس میں - مگر ہم نے علی گڑھ سے چلتے وقت محترم میہربان سے کرایہ تو وصول کیا - فرسٹ کلاس کا اور ٹکٹ لیا انٹر کلاس کا - اور باقی تمام دام "بحق والدہ ننھے میاں محفوظ" - اور یہ حرکت اس لیئے کی - کہ یہ تمام بڑے بڑے عہدہ دار اور افسر لوگ بھی ایسا ہی کرتے ہیں - کہ سفر تو کرتے ہیں تھرڈ کلاس میں اور سرکار سے دام وصول کرتے ہیں فرسٹ کلاس کے + یقین نہ ہو قبلہ سید سجاد حیدر صاحب ڈپٹی کلکٹر سے دریافت کر لو ٭

غرض انٹر کلاس میں سفر کرتے وقت دعا کی - کہ اے مصطفےٰ کمال پاشا ایسے اونی سپاہی کو تمام یورپ پر غالب کرنے والے خدا - ہمارے سفر کے لیئے کوئی ذی علم انسان دے - کوئی انشاء پرداز دے - کوئی مصنف یا مترجم دے - کوئی لیڈر یا ایڈیٹر دے اور جو یہ کوئی نہ ہو تو کم از کم کوئی علی گڑھ کا والنٹیر یا خلافت کا رضاکار ہی دے دے - کیونکہ ایسے ہی لوگ ہو سکتے ہیں - جنہیں ہمارے ذوق سے کوئی مناسبت ہو سکتی ہے - لیکن ذرا دیکھنا فطرت کی فیاضی کو - کہ ہمارے وطن تک کے جو ہم سفر ہمیں ملے وہ تھے "ڈاکٹر صاحب" ٭ کہیئے کتنا معقول جوڑا ملا ؟ اب خوبی پر خوبی یہ کہ ان ڈاکٹر صاحب کی جدید معلومات - روشن خیالی اور خوش

ذوقی کا یہ عالم تھا۔ کہ اس ۱۹۲۸ء میں بھی وہ اپنی ڈاڑھی پر
فریدآباد کی مہندی لگائے ہوئے تھے۔ جس سے ڈاڑھی کا ایک
ایک بال سرخ ہو رہا تھا + بس اُنہوں نے بڑے ہی خشوع
وخشوع سے ایک مرتبہ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ اور جمائی لے کر ہمارے
پاس بستر بچھانے میں مصروف ہو گئے + ہم نے سمجھ لیا کہ یہ ہے
موقع کہ ہم اور ہمیں رخصت کرنے والے احباب کہیں خدا حافظ ہے

ڈاکٹر صاحب کی روشن خیالی کے ثبوت میں اُن کے ساتھ
مٹی کا ایک ایسا وضو کرنے والا لوٹا بھی تھا۔ جو سیٹ کے نیچے
رکھا تھا۔ اور اُس کی راہ آبپاشی سے پاس والے مسافروں کے
جوتوں کا چمڑا نہایت نرم اور آرام دہ ہوتا جاتا تھا۔ گویا پالش میں
جوتوں پر جم جانے والی خاک کو یہ لوٹا اِس قدر خاموشی سے دھوتا
جاتا تھا۔ کہ مسافروں کو اُس کی اس خدمت کا اُس وقت علم
ہوتا تھا۔ جب وہ جوتا پہنتے وقت گردن جھکا کر کہتے "ارے
لاحول ولا"! مگر ڈاکٹر صاحب اس پر بھی تاکید فرماتے تھے۔ کہ
"اماں اُس میں وضو کا پانی ہے۔ پھینک نہ دینا" + اس کے بعد
ڈاکٹر صاحب نے لیٹے لیٹے اس زور شور سے جمائیاں لینا شروع
کر دیں۔ کہ تمام مسافروں کے مُنہ آپ کی طرف خود بخود پھر پھر
گئے + پس ممدوح کی ان حرکات سے ہم نے اپنی عافیت کا

اندازہ کر کے خود کو کتاب "سپر گل" کے مطالعہ میں بڑے زور سے محو و مصروف کر دیا + پہلے تو ارادہ تھا - کہ پڑھنا وڑھنا تو ایک طرف بس کتاب میں خود کو ذرا مصروف سا ظاہر کر کے ان سرخ داڑھی والے بالشویک ڈاکٹر صاحب سے ذرا محفوظ ہو جائینگے - ورنہ مبادا کہیں ڈاکٹر صاحب ہماری داڑھی کے فقدان پر سوالات کا تار باندھ دیں - مگر اثر الٹا ہوا کہ اس کتاب میں دل لگ گیا - اور اس کے کوئی سو صفحات پڑھ کر ہم نے ایک جمائی لی +

اس بے نظیر کتاب کے (۲۰۵) صفحات ہیں تین اوپر دس افسانے پھیلے ہوئے ہیں یا پھیلے پڑے ہیں - جنہیں پڑھ کر جب ہمارا دل و دماغ باغ باغ ہو گیا - تو پھر خوش ذوق لوگوں کا کیا حال ہو گا ؟

ان افسانوں میں انسانی سیرت - خواص - تاثر - محبت - ہمدردی اور اخلاق کے جتنے بھی گر بتلائے ہیں وہ سب کے سب فوائد سے لبریز ہیں - اور اسی لئے ہمارے خیال میں کتاب "سپر گل" میں وہ سب کچھ ہے - جو علی گڑھ میں کامل سولہ برس ہاکی اور ٹینس کھیلنے سے بھی نہیں ملتا +

نوٹ - جس سے کہا ہے کہ فسانہ ایسی عبارت کو کہہ سکتے ہیں - جس کے ختم ہونے پر انسانی دل و دماغ کو ایک برتر قیاس اور مفید فائدہ کا اثر

حاصل کرے۔ سو اس لحاظ سے یہ کتاب ایسے ہی فسانوں کا مجموعہ ہے +
افلاطون نے کہا کہ فسانہ کی دوسری خوبی یہ ہے کہ فسانہ
نگار کے قلم میں ہر چیز یا ہر حرکت کا صحیح نقشہ کھینچ دینے کی
قوت ہو۔ سو اِس قاعدے سے جلیل احمد صاحب قدوائی کو بی۔
اے ہونے سے پہلے بھی یہ قدرت حاصل تھی اور بی۔ اے کے
بعد تو نہایت مکمل ہو چکی ہے جس کا ثبوت یہ افسانے ہیں + یہ
جلیل احمد صاحب ہی کا قلم ہے۔ جو ہر عبارت میں انسانی جذبات
نسوانی جذبات (یہاں نسوانی جذبات کاتب صاحب کی
غلطی سمجھئے) فطرت اور جمال فطرت کے تمام نقوش و
اثرات کو اُن کے اصل رنگ میں کھینچ کر رکھ دیتا ہے۔ اور اِسی
لئے ان حالات و اثرات کو دِل و دماغ اُسی طرح قبول کر لیتے
ہیں۔ جس طرح آنکھ کسی اصل شے کو دیکھ کر پسند کر سکتی ہے۔
اور یہ بات اصل میں حاصل ہوتی ہے زبانِ فسانہ یا تحریرِ فسانہ
کی امداد سے۔ یعنی جو فسانہ نگار زبان کے اندر اظہار خیال کی
مافوق الفطرت قوت رکھتا ہے اور جو زبان کو اس طرح بولتا
اور لکھتا ہے۔ کہ اُس میں اُسے کسی جگہ متکلف سے کام لینا
نہ پڑتا ہو۔ تو ایسا ہی فسانہ نگار ہو سکتا ہے جو کامیاب ہوگا
یہ اکبر آبادی فسانہ نگاری نہیں کہ ارتعاش خفی۔ دیویتِ عظمیٰ۔
موسیقیتِ رنگین۔ نغمۂ لرزاں۔ شفقستانِ نگاریں ۔ اور

بہارستانِ مرزیں کے سے الفاظ بھر دیئے اور انہیں فسانۂ عریاں کہہ دیا ✤

لارڈ کرزن نے کہا ہے۔ کہ فسانہ کی کامیابی اُس کے طرزِ ادا پر موقوف ہے (لفظ ادا کے لئے ہمیں قدوائی صاحب معاف فرمائیں) یعنی فسانہ نگار کسی واقعہ کو ایسے الفاظ میں بیان کرے۔ جس کے اثرات یا مقاصد ناظر و قاری کے دماغ سے گزرتے ہوئے سیدھے دِل پر جا بیٹھیں ✤ پس یہ خوبی کتاب "سیر گل" کے ہر صفحہ میں موجود ہے ✤

مارشل مصطفےٰ کمال پاشا نے کہا ہے۔ کہ فسانہ میں جن واقعات و حالات کو بیان کیا جائے۔ اُن کے اندر اُن کے مواقع و مناظر کو اس خوبی سے بیان کر دیا جائے۔ جس میں کوئی صنعت یا تکلف محسوس نہ ہو سکے۔ کیونکہ واقعات اپنے مواقع کی امداد سے زیادہ خوبی کے ساتھ سمجھے اور قبول کئے جا سکتے ہیں۔ مگر یہ اہم مقصد اسی وقت پورا ہو سکتا ہے۔ جب فسانہ نگار وسیع العلم اور کثیر حالات سے واقف ہو اور اسی مقصد کو عرفاً "مناظر کشی" کہا ہے۔ سو اس حیثیت سے کتاب "سیر گل" جس درجہ مکمل ہے۔ اُس کی تعریف نہیں کی جا سکتی ✤

بادشاہ رضا خاں پہلوی نے کہا ہے۔ کہ فسانہ کی اصل کامیابی بلکہ ہر تحریر کی کامیابی یہی ہو سکتی ہے۔ کہ اُسے

بکثرت اشخاص اور اشخاصیاں پڑھیں (یہاں اشخاصیاں جیسے اونٹنی سے اونٹنیاں کی جمع کے قاعدے سے درست ہے) اور یہ مقصد اسی وقت مکمل ہو سکتا ہے۔ جب طرز بیان عام فہم ہو۔ لیکن زبان اردو کے موجودہ خصوصاً نوجوان اہل قلم اپنی کم علمی کے باعث اس اہم نکتہ کو یکسر بھلا بیٹھے ہیں۔ وہ نہیں اندازہ کرتے کہ ہمارے موٹے موٹے اور بلاغت ربود الفاظ اور غیر مانوس تراکیب کو کون سمجھیگا۔ جبکہ ہندوستان شریف میں پہلے ہی لکھے پڑھے افسانوں کی تعداد پانچ فیصدی ہے اور اسی لئے اردو کے فسانہ نگار اگر کسی گاؤں یا جنگل کا منظر دکھانا چاہینگے تو یوں لکھینگے کہ

"اس فردوس آفریں پہاڑ سے چشمہ ہائے زمزم اس طرح پیدا تھے جس طرح کوئی نظر فریب و بہار افزا ابر آب کوثر کو سطح ارضی پر اس طرح برسا دے۔ کہ اس سے ایک عالم آباد اور دلکشا سبزہ رنگین پیدا ہو جائے" لاحول ولا +

اب بتلایئے کہ اس قسم کی عبارت سے بے اپنے ہاں کے لالہ لوگ پٹواری صاحبان۔ نقشہ نویس۔ ہیڈ کانسٹیبل تھانہ روغیرہ چپراسی اور چوکیدار صاحبان کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ اور گدھے ہیں وہ اہل قلم جو اپنی تحریر کو صرف مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا ظفر علی خاں اور مولانا احمد سعید صاحب ایسے ذی علم اشخاص کی سمجھ کے قابل رکھنا چاہتے ہیں جبکہ ایسے قابل لوگوں کے لئے کوئی تحریر لکھی ہی نہیں جاتی + ہمیشہ

اصلاحی تحریروں کا مقصد کم علم اور بے خبر لوگوں کو سمجھانا ہوتا ہے۔ اور ایسے لوگ کبھی ایسی تحریر سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے جس میں ٹیگوری رنگ کی بلاغت ربودی ٹھونس دی گئی ہو اور اسی لئے تو مارشل رضا شاہ پہلوی اور امیر امان اللہ خاں غازی کہتے ہیں۔ کہ زبان اردو کے تمام اشارات کی تحریر کو نہایت درجہ آسان اور عام فہم ہونا چاہئے + پس اس نہایت اہم کلیہ کے موافق حضرت خلیل احمد صاحب قدوائی کے تمام افسانوں کی مناظر کشی اس درجہ صحیح اور مناسب یا عام فہم ہے۔ کہ باید و شاید + مثلاً وہ ایک جگہ گاؤں یا دیہات کے ایک موقع کو یوں لکھتے ہیں کہ:-

"دس بیس چھوٹے چھوٹے دیہات ملا کر پورا قصبہ۔ یہاں کی سڑکیں کچی اور تنگ۔ اکثر پگڈنڈیاں ہیں جو کھیتوں کی مینڈوں پر ہو کر باغوں کے درمیان سے گزرتی ہیں"۔

دیکھئے یہاں دیہاتی موقع کی مناسبت سے۔ پگڈنڈیاں۔ کھیتوں کی مینڈیں اور کچی سڑکیں وغیرہ الفاظ کس درجہ سمجھ میں آجانے والے ہیں! اسی طرح وہ ایک جگہ ایک شخص کے خیالات کو بیان کرتے ہیں:-

(مسٹر ہرنے کہا) میں نے اسکول کی تعلیم ختم کی اور بنارس یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے مجھے بھیجا گیا تھا میں پہلے پہل اپنے والدین سے جدا ہوا۔ شروع شروع تو میں قریب قریب

ہر مہینہ اپنے گھر آکر سب کو دیکھ جاتا۔ مگر رفتہ رفتہ جدائی کا عادی ہو گیا "+

دیکھا اس عبارت میں زبان۔ روزمرہ۔ سادگی۔ سلاست اور فصاحت کو؟ اور کمال تو یہ ہے کہ قدوائی نے اپنے اہم سے اہم علمی و اخلاقی فسانے اسی سلیس عبارت میں لکھے ہیں۔ اور علی گڑھ ایسی بلاغت نگار فضا میں رہ کر لکھے ہیں!

غازی عبدالکریم فاتح ریف نے کہا ہے کہ ہر تحریر جو کتاب یا عام مطالعہ کی غرض کو لیکر لکھی جائے اس کا مقصد یا فائدہ کبھی کسی ایک جماعت یا قوم سے متعلق اور مخصوص نہ ہو۔ بلکہ اس کا انداز بیان ایسا ہو کہ اسے ہر جماعت اور ہر قوم صرف اپنے لئے خاص سمجھے۔ مگر یہ نکتہ سوائے ہمارے اب تک کسی اہل قلم نے بھی نہیں سمجھا۔ بلکہ نئی جماعت نے تو اس کے خلاف ہمیشہ اپنی تحریروں کو تعصب و جانبداری کے رنگ میں پیش کیا۔ اور اسی لئے آئے دن تمام بھلے مانسوں کو۔ ہندو مسلم فساد کے بھلانے سے کوتوالی میں جانا پڑتا ہے + یہ تو ماشاء اللہ ہمارے ہی مضامین میں خوبی ہے۔ کہ ہوتے تو ہیں صرف مسلمانوں کی اصلاح کے لئے۔ مگر انہیں یہ اپنے ہاں کے تمام ہندو بھائی سکھ بھائی۔ پارسی بھائی اور جب سے خلافت کا خاتمہ ہوا ہے تو یہ انگریز بھائی بھی انہیں اپنے ہی لئے سمجھتے ہیں + مگر اب

کتاب "سیر گل" میں یہ بات دیکھ کر مسرت ہوئی کہ قدوائی صاحب کے افسانے اِس قابل ہیں۔ کہ انہیں مسلمانوں سے زیادہ ہندو بھائی خریدیں اور ہندو بھائیوں سے زیادہ مسلمان بھائی ÷

"سیر گل" کی یہ خوبیاں ہیں۔ جو کتاب کے مطالعہ کے وقت ان سے کہیں زیادہ اچھی اور اثر انداز انداز میں نظر آئینگی ÷ تنقید یا تبصرے کے قاعدے سے قدوائی صاحب کو ہمارا مشورہ ہے کہ وہ آئندہ کسی فسانے کا ترجمہ کرتے وقت اُس میں مواقع اور اشخاص کے نام بھی ہندوستانی ناموں پر رکھیں۔ تاکہ وہ زیادہ آسانی سے سمجھے اور پہچانے جا سکیں۔ اور ترجمہ کا یہ طریقہ کوئی غلط یا معیوب بھی نہیں مثلاً ظاہر ہے کہ "موسیو ٹراسکی یا مارشل ووڈی فو" اور ہنڈنبرگ کے مقابل عبداللہ خاں، رام لال اور عطر سنگھ کو ہندوستانی زیادہ آسانی سے سمجھ سکینگے ÷

کتاب سیر گل کی لکھائی چھپائی اس قدر اچھی اور صاف ہے۔ کہ دیکھا کرنا پڑتا ہے کہ ہماری کتابیں بھی ایسی ہی چھپ جائیں کاغذ بے حد مضبوط اور اِس قدر مضبوط ہے کہ اگر کتاب سنبھال کر رکھی جائے۔ تو دس برس تک ٹوٹ نہیں سکتی ÷ لکھائی چھپائی کی عمدگی کا سبب یہ ہے۔ کہ اس کے چھاپنے والے ملک کے مشہور منتظم مطبع حضرت" باہتمام مولوی مقتدیٰ خاں شروانی ہیں۔

اس کتاب کو جب خریدو تو خط پر لکھ دینا

بخدمت شریف مولوی جلیل احمد صاحب قدوائی بی۔ اے
یونیورسٹی۔ علی گڑھ۔ اور ہال قیمت ہے ڈیڑھ روپیہ

مُصلحین

مسلمانوں کا عقیدہ ہے۔ کہ اسلام اور صرف اسلام ہی کے اصول و ضوابط ہیں۔ جن کی تعمیل و اتباع سے انسان دینی و دنیوی نجات و کامیابی حاصل کر سکتا ہے اور جن مسلمانوں کو علوم اسلامی اور شریعت مصطفوی کے نکات و رموز سمجھنے کی توفیق ارزانی ہوئی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ شریعت عالیہ اسلامیہ نے انسانی ضروریات اور زندگی کا کوئی ایک حصہ بھی ایسا باقی نہیں چھوڑا۔ جس کے بغیر زندگی نامکمل سمجھی جاتی +

پس اسی شریعت مطہرہ نے چند ایسے فرائض بھی مقرر کر دئے ہیں۔ جن کے ذریعہ نظم قومی اور حیات اجتماعی کا بقا مقصود ہے اور انہی فرائض کے بجا لانے والوں کو "مصلح" کہا گیا ہے +

اب سوال یہ ہے کہ "مصلح" کے فرائض کیا ہیں؟ سو اس کا نہایت جامع جواب یہ ہے۔ کہ مصلح کی بہترین تعریف یہی ہے کہ "تبلیغ و اصلاح" کے لئے اس کی زندگی کا ہر فعل اور ہر عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا نمونہ ہو + اخلاقی

حیثیت سے مصلح کے لئے خلوص - صداقت - ہمدردی - بے غرضی - حق کشی - ایثار - خوش خلقی - عفو و کرم - صبر و رضا کے ساتھ ہی اعلاء کلمۃ الحق کے لئے شدت - بہادری اور بعض اوقات "اقدام" تک کا حکم دیا گیا ہے - پس اُس وقت سے کہ حضور اقدس و بنظیر ذات رسالت پناہی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آرام فرمایا ہے - ملت اسلامیہ کی اصلاح و تنظیم - حفاظت و نگہبانی اور تہذیب و ترقی کے یہی لوگ ذمہ دار ہیں - جنہیں اصطلاح میں "مصلحین" کہتے ہیں لیکن کیا سبب ہے کہ ہندوستان میں مسلمان مصلحین کی تعداد کمانی سے زیادہ ہے - لیکن مسلمانوں میں زندگی اور ترقی کی جگہ تباہی اور بربادی پھیل پڑی ہے ؟

بظاہر اس کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ "مصلحین" کی حالت خود قابلِ اصلاح و احتساب ہے - اور اس لئے ہم نے حال ہی کے ایک سفر میں جس میں ہمارے پندرہ روپیہ لوآنے خرچ ہوئے مصلحین کی حالت کا اندازہ کر لیا ہے

صوبجات متحدہ کے ایک "بڑے قصبے" کے رہنے والے ہیں - علی گڑھ میں جو بی اے - ایل ایل - بی تک تعلیم پائی ہے - تو ہم خدا اب ایک جگہ "افسر" ہو گئے ہیں - ہمارا یارانہ اُس وقت سے ہے - جب نومبر ۱۹۱۶ء میں ہم علی گڑھ کے اُس مشاعرہ میں

شریک تھے جس میں ہم نے بے طرح بھی کوئی غزل نہ پڑھی -
ہمیں خط پہ خط لکھ رہے تھے - کہ ایک ہی دن کے لئے آجایئے
تفریح ہو جائیگی - اور بہت سے مشتاقانِ رموزی فیض یاب ہو جائینگے
ہم نے بھی سوچا - کہ آج کل وہ بھی مہمان گئی ہوئی ہیں - گھر
میں بیٹھے بیٹھے کیا کریں ؟ اِس لئے کوئی ۲۷ - مارچ ۱۹۲۸ء کے
دن ریل میں بیٹھ گئے + ٹکٹ وہی فرسٹ کلاس کا تھا - صرف
اِنکسار کے طور پہ تھرڈ کلاس میں بیٹھ گئے - اِس لئے ہر قسم کی
تکلیف کا سامنا رہا - جس کے یہ معنی ہیں کہ محض غلامی کی وجہ
سے ہندوستانی لوگ ہندوستانی ریلوں میں نہ آرام پا سکتے ہیں نہ
پا سکینگے - کیونکہ اگر کونسلوں میں ریلوے والوں کو ڈانٹ بھی دیں
تو کیا ؟ وہ جو اوپر "گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل" بیٹھے ہیں وہ جب
تک اپنے دوست نہ بن جائیں کچھ بھی نہیں ہو سکتا اور اِسی لئے
سچ کہا کرتے تھے اللہ بخشے اپنے "بڑے مولوی صاحب" کہ یہ
ریل گاڑیوں سے تو اپنی بیل گاڑیاں ہی اچھی - جہاں چاہو روک
لو - جتنا چاہو تیز چلا لو اور جتنا چاہو آہستہ +
غرض چل پہ چل پہنچ گئے - اُسی اسٹیشن پر جہاں سے قصبہ
جانا تھا + کوئی ایک اوپر بیس احباب نے بغیر سیاہ جھنڈوں اور
"سائمن کمیشن گو بیک" کے نعروں کے ہمارا استقبال کیا - اور
ایک بیل گاڑی قسم اوّل میں بٹھا کر لے چلے ہمیں اُس طرف کہ

Taj Tahir Foundation

قصبہ کہیں جسے + اسٹیشن سے کوئی چار میل دُور تھی وہ کہ "منزل
کہیں اُسے + گاڑی روانہ ہوگئی - صرف سڑک تھی "کوفۂ بیخبتہ" -
اِس لئے کوئی ایک میل جاکر کمر ٹوٹی تو کیا مگر ہاں ٹوٹ سی گئی +
لیکن مشرقی آداب کا تقاضا تھا - کہ جب احباب دریافت کریں +
"ملّا صاحب کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟"
تو کہہ دیا جائے کہ "جی نہیں حضرت بڑے آرام سے ہیں" +
اب اِتّفاق تو کیا عذابِ الٰہی کہئے - کہ راستہ میں ایک نالہ آیا +
گاڑی کے بیل تھے گامّا اور نسبکو - اِس لئے اُتار کے بعد چڑھاؤ
یا چڑھائی پر اُنہوں نے پوری طاقت سے جو گاڑی کھینچی - تو گاڑی
کا جوا تو رہ گیا اُن کی گردن پر اور گاڑی ہم لوگوں کو لے کر نالہ کی گہرائی
کی طرف اس زور سے پسپا ہوئی - کہ ہم ایک دوسرے سے یہ بھی
نہ کہہ سکے کہ "کہا سُنا معاف کیجئیگا" +
آپ سمجھ لیجئے کہ یورپی کی طرف کے تعلیم یافتہ باشندوں کا
یکایک کسی عمیق گڑھے میں ایک کے اوپر ایک ہوکر جا پڑنا یا جا
گرنا کس قدر عظیم یا عظیم الشان حادثہ ہوسکتا ہے + بس فوراً ہی
آوازیں آنے لگیں - "ہائیں ہائیں! بسم اللہ - بسم اللہ! دیکھئے دیکھئے
اُٹھئے اُٹھئے + اُف توبہ! دیکھئے دیکھئے - وہ! ہاتھ سے خون
بہ رہا ہے - یہ دیکھئے میرے کس قدر خراش آگئی - سر میں تو نہ لگی؟
آپ تو بچ گئے - اماں بڑی خیر ہوئی - اُف چوہدری صاحب بیٹھ

جلیئے بیٹھ! کیا غسل آرہا ہے؟ ہائیں یہ کیا؟ ناک سے خون آرہا ہے + اماں اچھن - قمیص اتار قمیص - ویسے کیا نظر آئیگا - حضرت بے پروائی نہ کیجئے - تازہ چوٹ معلوم نہیں ہوتی + یہ دیکھئے نا - دونو گھٹنے کس قدر زخمی ہوگئے - اچھا اچھا شیروانی تو جھاڑیئے - لاحول ولا - چشمہ تو بیکار ہی ہوگیا! ذرا بھی میرے تین روپیہ کی دیکھ بھال نہ - اُفوہ - میرے پاؤں میں سخت سوزش ہورہی ہے - خیر چلئے - شکر ہے - کہ جانیں محفوظ رہیں - اماں اچھن تم کیسے چپ سادھے بیٹھے ہو! دیکھیں بھلا + اماں قمیص سے جھاڑ لو - اچھا تو ہڈی تو نہ ٹوٹ گئی؟ ذرا لیٹ رہو لیٹ + یہ لو شیروانی نیچے ڈال لو + اماں ذرا ٹانگ جھٹک دو + ہائیں ہائیں زور کیوں دگا رہے ہو؟ لاحول ولا - یہ لیجئے دو پانوں کی ڈبیہ تو ریزہ ریزہ ہوگئی + چوہدری صاحب کیا چکر آرہا ہے؟ خیر للا صاحب تو بچ گئے، پھر بھی بڑی خیریت رہی - مگر للا صاحب ذرا ٹہل کر دیکھ لیجئے - گرم چوٹ معلوم نہیں ہوا کرتی + جی نہیں ہمارے کوئی چوٹ نہیں - اور اگر ہو بھی تو مطمئن رہئے - ہم کوئی شکایت نہیں کرینگے - کیونکہ ہم ہیں سی - پی کے باشندے اور "شیرانی الافغانی بھی"

اب اس ہنگامے کے بعد گاڑی چلانے والے سے باقاعدہ جرح شروع ہوئی - "تو کیا تجھے نظر نہ آتا تھا؟ اسلیے تو اندھے - دلاجئے کی رسی کو پہلے ہی دیکھ لیا ہوتا - ایسا بھی کوئی گاڑی

چلاتا ہے ؟ اور جو ابھی کوئی مر جاتا تو ؟ تو بیل کو مارنے کی کیا ضرورت تھی ؟ اب رہنے بھی دے - جیلے تراش رہا ہے - چل فضول بکواس نہ کر ! تو رسی نہیں ٹوٹی تو کیا فرشتوں نے گاڑی گڑھے میں پھینک دی ؟ ہاں ٹھیک ہے - تو بھیا یوں کیوں نہیں کہتا ؟ چل چل دیکھ بائیں کو بچاتا چل ! دیکھ دیکھ - پھر تو نے گاڑی موڑ دی ! لاحول ولا + اماں اچھن تم لے لو - یہ تو گنوار ہی گنوار خیر الحمد للہ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت - اماں - ملا صاحب آرام سے بیٹھئے - تو آگے آجائیے نا + تو تکیہ تو لگا لیجئے !

اس حادثے سے فارغ ہو کر قصبے پہنچے + تحصیلدار صاحب نے بڑے تپاک سے اس لئے استقبال کیا کہ علی گڑھ کی جگہ دیوبند میں تعلیم پائی تھی + گاڑی سے اترتے ہی کوئی پندرہ منٹ تک احباب نے گاڑی کے حادثہ کی تفصیلات قصبے والے احباب کو سنائیں +

اماں - خدا نے بڑی ہی خیر کی - واللہ میں تو بال بال بچا - خدا کی قسم کلو بھائی تم ہوتے تو دیکھتے - اماں چوہدری صاحب تو از سر نو زندہ ہوئے + ملا صاحب نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا اور جو کبھی تین منٹ ہی گاڑی سیدھی نہ ہو - تو واللہ گئے تھے سب خدا گنج وغیرہ وغیرہ +

یہ عمر میں پہلا موقع تھا - جب لوگ ہمارے استقبال کے ساتھ رسم عیادت بھی انجام دے رہے تھے اور بار بار خیال آتا

تھا کہ بھلا یہ لوگ بھی انگریزوں سے سوراج لے سکتے ہیں؟
میزبان کے ہاں پہلی مرتبہ کھانے پر بیٹھے۔ تو کوئی دو منٹ
بعد تمام احباب کھڑے ہوگئے۔ اور کہا گیا۔ کہ "میاں صاحب
تشریف لے آئیے میاں + خدا معاف فرمائے۔ ہم بھی گھبرا کر
کھڑے ہوگئے + ایک صاحب تشریف لائے + ولایتی سلک
کی عبا۔ ولایتی چکن کا نیچا کرتا۔ کرتے کے نیچے گلابی رنگ کی بنیائین
بمبئی کی قیمتی صدری۔ ولایتی موزے اور دہلوی جوتا۔ خاص لنڈن
کا چشمہ آنکھوں پر۔ ویسٹ اینڈ واچ کمپنی کی ایک گھڑی جیب
میں اور ایک کلائی پر + تمام حلقی قوتیں خرچ کر کے فرمایا "السلام
علیکم"! احباب نے بغیر وعلیکم کے ہاتھوں کو بوسہ دینا جو شروع
کیا۔ تو ہم نے گھبرا کر پاس والے دوست سے کہا۔ "یہ کون
صاحب ہیں؟ کہنی مار کر کہا۔ "اماں ایک بزرگ ہیں"!
ہم تاڑ گئے کہ یہ حضرت خود ان بزرگ صاحب کی بزرگی کے
قائل نہیں۔ ورنہ یہ تعارف کے وقت ہمارے کہنی کیوں مارتے؟
اور لفظ "اماں" کیوں استعمال فرماتے؟ بزرگ صاحب کے لئے
وسط میں جگہ خالی کر دی گئی۔ اور موصوف لئے خاص الخاص
مراد آبادی لہجہ میں دیر حاضری کی معافی کیا چاہی۔ داستان
امیر حمزہ شروع کر دی۔ اور خلاصہ یہ تھا۔ کہ میں ڈپٹی صاحب
کے بنگلہ پر تھا۔ وہ مجھے اٹھنے نہیں دیتے تھے۔ کیونکہ مجھ

سے بھی عقیدت رکھتے ہیں + انکی اِس قسم کی بے تکی باتوں پر ہمیں پھر غصہ آیا - تو اُنھوں نے بھی پھر کہنی مار کر کہا - اماں تمہیں کیا پڑی تم کھانا نہ کھاؤ +

احباب کی ستم ظریفی دیکھئے - کہ جب کھانے سے فارغ ہوئے تو کہا - میاں - یہ ہیں حضرت ملّا رموزی صاحب + میاں نے اُخو کہہ کر بیساختہ فرمایا - مگر ملّا صاحب یہ داڑھی تو ذرا . . . . + مناسب - یہی سمجھا کہ کہہ دیں - بہت اچھا - اس لئے کہہ دیا "بہت اچھا" + میاں نے فرمایا :-

"تو ملّا صاحب پھر شام کو غریب خانے ہی پر ماحضر تناول نہ فرمایئے ؟"

یہ ایک تبسم کا اون بھی تھا - اور گریز بھی + استفسار بھی تھی - اور ٹال بھی + مگر ہم نے فوراً ہی کہا - "بہت اچھا - تو کب حاضر ہونا چاہیئے ؟" اب تو میاں کو کہنا ہی پڑا - "وہی عشاء کے بعد" +

میاں کا شرعی لباس تو اوپر ملاحظہ فرما لیا اب میاں کا "غریب خانہ" بھی ملاحظہ ہو - عشاء کے بعد آدمی آیا - "چلئے میاں یاد فرماتے ہیں" + گئے تو ایک شاندار کوٹھی نما عمارت میں بٹھائے گئے + وسط میں باغ تھا + باغ میں فوّارے چھوٹ

رہے تھے۔ صحن اور کمروں کے اندر بڑے بڑے فانوس روشن تھے
کھانے کے کمرہ میں بڑی بڑی الماریوں میں بجائے کتابوں کے
رقسم رقسم کے کھانے کے برتن اور چاء کے برتن عرف سیٹ رکھے
ہوئے تھے۔ دیواریں قدِ آدم آئینوں سے آراستہ تھیں۔ کہیں کہیں
سنگ مرمر کے شاندار نقشے بھی تھے۔ ایک حصّہ میز کرسی سے
آراستہ تھا۔ دو بڑی بڑی گھڑیاں دیواروں پر آویزاں تھیں۔ وسط
میں اعلےٰ درجہ کے قالین تھے۔ جن پر کہیں کہیں ہرن کے چمڑے
کی جانمازیں بچھی تھیں۔ کیونکہ بزرگ کا مکان تھا۔ اور جیسے
بھی آج کل چٹائی کی جانماز پر نماز مکروہ ہو جاتی ہے + ایک
طرف بڑے بڑے مُراد آبادی اُگالدان اور آفتابے قرینے سے
رکھے ہوئے تھے۔ خدّام کے ہاتھوں میں ولائتی صابون اور
تولئے تھے۔ اور کمال یہ کہ اس خاص لفٹنٹ گورنر انہ کوٹھی کا
نام تھا دار الفقراء کہئے ملاحظہ فرمایا۔ فقیروں کا مکان اور فقیروں
کا لباس؟ اخلاق کے متعلق وہی کہنی مار دوست فرماتے تھے۔
کہ جو شخص موٹر سواری میں بھیجے۔ بس اُسی کے مکان پر میاں
تشریف لے جاتے ہیں۔ اور موٹر والے لوگ ہی میاں کی توجّہ
کے قابل ہیں + موٹر والے افسروں کے گھر میاں کبھی کبھی خود
ہی بغیر موٹر کے بھی چلے جاتے ہیں۔ غریبوں سے پیشانی پر
شکن ڈال کر بات کرتے ہیں + اب ان شاہانہ حالات کو ملاحظہ

فدا رسول گرامی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اُس محترم زندگی سے۔ جس میں سادگی۔ فقر و رضا اور مشقت کے وہ برگزیدہ نمونے ملتے ہیں۔ جن کی تقلید ان مصلحین کا فرض اوّل تھا +

دُنیا پرستوں کا یہ "بزرگ نما" گروہ ہے۔ جو انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کی بے خبری سے فائدہ اُٹھا کر اُن پر ٹوٹ پڑا ہے۔ اور علم دین سے بے بہرہ رؤسا و اُمراء کو خوب لوٹ رہا ہے +

اِس آنکھوں سے دیکھے ہوئے نمونے کے بعد اور بھی خواہ مخواہ کے بزرگ سامنے آجاتے ہیں۔ مثلاً ایک گروہ ہے جس کے افراد نے اپنی کمائی حلقۂ دیہات اور قصبات کی بے خبر اور معصوم آبادی کو قرار دے رکھا ہے + اس گروہ کے افراد کا لباس اکثر رنگین ہوتا ہے۔ نیچا رنگین کرتا۔ لمبے لمبے بال۔ تہمد اور گلے میں تسبیح کے ہار۔ ان بزرگوں کے ہمراہ ان کے چیلے بھی ہوتے ہیں + یہ کسی قصبے یا گاؤں میں پہنچ کر برگد کے سایہ دار درخت کے نیچے قیام فرماتے ہیں + گاؤں والے صورت دیکھتے ہی چارپائی۔ حقہ۔ پانی کا مشکا اور آٹا۔ دال وغیرہ فراہم کر کے اُن کے ارشادات سننے جمع ہو جاتے ہیں۔ اور چارپائی پر لیٹے لیٹے اُلٹے سیدھے قصے سُنایا کرتے ہیں۔ اور چیلے اِن قصّوں پر کبھی گردن ہلاتے ہیں کبھی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ اور کبھی روتے روتے بیہوش سے ہو جاتے ہیں + جس دِن گاؤں میں "بڑا بازار ہوتا" ہے

اُس دِن یہ بزرگ صاحب وعظ یا میلاد شریف کی بیٹھتے ہیں ۔ اِن میں سے بعض طوطیٔ ہند بھی ہوتے ہیں ۔ ان کی علمی قابلیت مولانا رُومؒ کی مثنوی کے چند حصّوں میں بند ہوتی ہے یا اس قسم کے رقعے سنایا کرتے ہیں ۔ کہ ایک بزرگ نے ایک مرتبہ ایک بھینس پر کچھ پڑھ کر جو دم کیا ۔ تو وہ فوراً ہاتھی ہوگئی + اِس گروہ کا گاؤں والوں کی طرف سے سالانہ لگان یا محصول یا باج بھی مقرّر ہوتا ہے +

مصلحین کا ایک اور گروہ ہے ۔ جس نے ہمیں اور آپ کو چھوڑ کر صرف رنڈیوں ہی کی اصلاح و تہذیبِ نفس کا بیڑا اُٹھا رکھا ہے ۔ اِس طبقے کے افراد رنڈیوں کے ہاں مہمان بھی رہتے ہیں ۔ اِن کا لباس نفاست کا نمونہ ہوتا ہے ۔ لمبے لمبے بالوں میں اصغر علی محمد علی کے کارخانہ کا چنبیلی قسم اوّل کا تیل ۔ کوئی رنگین کرتا عطر میں بسا ہُوا ۔ آنکھوں پر نہایت نفیس چشمہ ۔ کلائی پر کوئی قیمتی گھڑی اور مثنوی شریف پڑھنے کے لئے گلا صاف ۔ علم و فضل کی جگہ اللہ کا نام ۔ مذہبی دلائل کی جگہ امیر و داغ کے عاشقانہ اشعار + بعض کو شعار بجانے کی بھی مشق ہوتی ہے +

ایک طبقہ وہ ہے ۔ جسے علوم دین سے دُور کا بھی علاقہ نہیں ۔ مگر گزارہ صرف گنڈے تعویذ کی آمدنی پر اور ہر تعویذ

ایسا کہ بس "مشکل کشا" اور اولاد انگیز ؛

یہ ہیں وہ چند گروہ مصلحین ہند کے جو مسلمانوں پر سوار ہیں۔ اور یہ سات آٹھ کروڑ مسلمانانِ ہند ایسے ہی مصلحین میں بٹے ہوئے ہیں ؛ یہ مصلحین انہیں جس طرف چاہتے ہیں۔ لے چلتے اور چرا لے جا رہے ہیں ؛ اب کوئی ان مصلحین کی خدا دانی۔ علوم آگہی۔ معاشرت۔ اخلاق اور اعمال کو رسولِ گرامی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی سے ملائے۔ اور پھر بتلائے کہ کیا ایسی ہی خالص دنیا پرست زندگی کے ساتھ رسولِ محترم علیہ السلام کی قائمقامی اور اصلاح و ہدایت کا دعوے صحیح ہو سکتا ہے ؟

ضرورت ہے۔ کہ تعلیم یافتہ طبقہ ایسے مصلحین کی اصلاح و نگرانی کی طرف مائل ہو۔ جو گھن کی طرح مسلمانانِ ہند کی اجتماعی اور دینی زندگی کو تباہ کر رہا ہے ؛ تعجب ہے کہ علم و فضل کی روشنی میں بھی مسلمانانِ ہند کو ایسے مصلحین نظر نہیں آتے۔ اور خصوصیت سے یہ علی گڑھ کے بیرسٹر لوگ اور ڈپٹی کلکٹر لوگ ہی زیادہ ان کے قبضے میں ہیں ؛

یہ ہے اصل میں نتیجہ علم دین سے بے خبری اور غفلت کا ؛

(رسالہ صوفی پنڈی بہاء الدین اپریل و مئی ۱۹۲۸ء)

پشاور تک مگر علی گڑھ تک

۲۸۔ نومبر ۱۹۲۷ء کو مفتیِ اعظم حضرتِ علامہ محمد کفایت اللہ جمعیتہ العلماء ہند کا گرامی نامہ ملا کہ "جمعیتہ کے سالانہ اجلاس پشاور کی شرکت کے لئے آپ کا نام پشاور کی مجلسِ استقبالیہ کو بھیج دیا گیا ہے۔ تیار رہو" ؛

ننھے میاں کی والدہ سے پشاور تک سفر کا تذکرہ جو کیا۔ تو انہوں نے جو طویل جوابات عطا فرمائے ان کے "جملہ حقوق بحق راقم الحروف محفوظ" رہنا ہی زیادہ مناسب ہے + بستر باندھ دیا۔ کپڑے رکھ دئے۔ کھانا پکانے بیٹھ گئیں۔ صرف ہم سے خندہ پیشانی سے بات کرنا ترک کر دیا۔ ننھے میاں پر بات بات میں جھنجھلانے لگیں۔ برتن کو زمین پر رکھنے کی جگہ پٹک دیتی تھیں۔ کوئی دو ڈھائی گھنٹہ تک تازہ پان بھی نہ کھایا۔ ہر بات میں "آگ لگ جائے" کا استعمال زیادہ فرمانے لگیں۔ بس ان تیوروں سے ہم تاڑ گئے۔ کہ یہ سب کچھ ہمارے سفر پر نہیں بلکہ "سفر خرچ" پر اظہارِ ناراضی ہو رہا ہے۔ اور چونکہ اس سے قبل بھی انہیں روپے پیسے کے معاملوں میں آزمائے ہوئے تھے اس لئے آہستہ سے کھانستے ہوئے اٹھے۔ اور اپنے علم پر درود

معارف نواز کرم فرما حضرتِ رُشدی سے کرایہ کو کہہ دیا + علم نواز رُشدی صاحب پہلے تو اُن کے ہمارے اس معاملہ پر بہت ہنسے۔ اور پھر نوٹ دے دیئے +

کہتی ہی رہ گئیں۔ "کب تک واپس آؤ گے"؟ مگر ہم نے جو بستر اُٹھایا۔ تو پھر اُن کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ صرف ننھے میاں کی طرف ایک روپیہ پھینک کر چل دیئے +

ریلوں میں اب یہ ہوتا ہے کہ سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لے کر بھی ہندوستانی تھرڈ کلاس میں مارے مارے پھرتے ہیں اور کوئی ممبر کونسل سوال نہیں کرتا۔ کہ آخر یہ ریلوں میں مسافروں کی تعداد کے برابر ڈبے پورے کیوں نہیں ریل میں جوڑتے ہو؟ ممکن ہے رائل کمیشن کے بائیکاٹ سے ریلوے کے انگریز کچھ ڈر جائیں؟ ادھر ہماری یہ ایسی بُری عادت ہے۔ کہ جب تک ہمارے ڈبے میں کوئی انگریز "مع اہل و عیال" کے نہ سفر کرے۔ ہمارا جی نہیں لگتا۔ اور ان مراد آبادی وضع کے رسّی سے بندھے ہوئے لوٹے لے کر سفر کرنے والوں کے ہمراہ تو سفر دوبھر ہو جاتا ہے۔ مگر وہاں جو سیٹی ہوئی۔ تو مُنہ کے سامنے والے ہی ڈبے میں خود کو مع بستر ٹھونس دیا + بغیر قلی کے خود بستر لے کر ریل میں سوار ہونے کو ٹھونس دینا ہی کہنا زیادہ مناسب ہے!

کوئی چار پانچ اسٹیشنوں تک وہی ننھے میاں کی والدہ کی

غضب ناک باتیں یاد آتی رہیں - اور برابر سوچتے رہے - کہ اب کی بار پشاور سے آکر اُن سے یہ کہہ دیں - دیکھو جی . . . .

غرض اس خانگی مذاکرۂ علمیہ و ادبیہ کی مصروفیت میں ڈبّے کے ساتھیوں کا کوئی خیال نہ رہا + بارے ایک بڑے اسٹیشن پر گاڑی ٹھیری - تو دیکھا کہ نوعمر بے فکرے پوری مستعدی سے اس ڈبّے کے آس پاس چکّر لگا رہے ہیں - جس کے اندر ہندو مسلمان "ماں بہنیں" سوار ہوتی ہیں - اور جنہیں ہر مذہب نے نامحرم بتلایا ہے + مگر کالجوں کی تعلیم کا زمانہ ہے - اور پروفیسروں کی تربیت +

خدا جلائے یہ کنگ پرائمر پڑھے ہوئے ہندوستانی اپنے قومی لباس چھوڑ کر کوٹ پتلون کس جذبے کے ماتحت استعمال فرما رہے ہیں ! اور تو کچھ نہیں - لباس کی اس یگانگت سے ہمیں تکلیف یہ ہوتی ہے - کہ ہم ہر پتلون پوش کو مسلمان سمجھ کر السّلام علیکم کہہ گزرتے ہیں - اور وہ آہستہ سے معاف کیجئے میں ہندو ہوں کہہ کر شرمندہ ہو جاتے ہیں + بس اس اسٹیشن پر ایسے ہی ایک ہندو بھائی ہمارے ڈبّے میں عین اس وقت گھس پڑے - جب ہم صبح کے ناشتے کے لئے ڈھائی آنے پاؤ والی پوریاں لوگوں کی نظریں بچا کر لینے کے لئے پلیٹ فارم پر گھوم رہے تھے + انہوں نے ڈبّا ذرا خالی پاکر ایک سیٹ پر

اپنا انگریزی وضع کا بستر بچھایا - اور مع کوٹ پتلون اُس پر لیٹ گئے - اور ایک کتاب کھول کر سینے پر تان لی + پھر ایک ہاتھ پتلون کی جیب میں لیٹے لیٹے اس طرح ڈال لیا - گویا سر آسٹن چیمبرلین وزیر خارجہ وکٹوریا اسٹیشن لندن سے جمعیتہ الاقوام کی شرکت کے لئے اپنے خاصے کے اسپیشل میں جنیوا جا رہے ہیں + کبھی کبھی پتلون کی جیب سے ہاتھ نکال کر سر سہلا لیتے تھے - گویا کسی بڑے ہی زبردست سیاسی معاہدے کو ملاحظہ سے حل فرما رہے ہیں + ادھر موصوف کی اِس کتاب بینی سے ہم بقیہ چار مسافر خود بخود جاہل - بے ذوق - بدمذاق اور بیوقوف ثابت ہوئے جا رہے تھے - اور یہ بھی کچھ موزوں نہ تھا - کہ ہم باقی مسافر بھی ان کی طرح کتابیں کھول کر بیٹھ جائیں - ور.. اس حساب سے یہ ریل کا ڈبا کا کا کورہتا - خاصی علی گڑھ کی اٹن لائبریری ہو جاتی + اس لئے نہ رہا گیا - اور ہم ممدوح کے قریب جا کر بیٹھ گئے - اور اُن کے ساتھ ساتھ اُن کی کتاب کو پڑھنا جو شروع کیا - تو بھائی صاحب نے ہمیں سر سے پاؤں تک دیکھا + ہم نے عرض کیا - کیا اِس کتاب کو ہم بھی دیکھ سکتے ہیں ؟" جواب ملا - "پانچ صفحے اور رہ گئے ہیں - اُنہیں دیکھ لوں :- مگر ہمارا ارادہ یہ تھا کہ جس طرح طلبا کے لحاظ اور بہادری اُٹھ گئی ہے - اسی طرح ہمارے ڈبے سے کتاب بینی ہی اُٹھ جائے - اِس لئے اب ترکیب یہ کی - کہ ان سے

خواہ مخواہ سوالات شروع کر دئے - اور کوئی سوال ایسا نہ کیا جس کے جواب سے وہ پندرہ منٹ سے پہلے فارغ ہو جاتے - یہاں تک کہ شیر کے شکار ایسے دور از عقل موضوع پر اظہار رائے پر مجبور کر دیا - تو اب بھی بھائی صاحب نے کتاب کو سر کے نیچے رکھ کر جوابات سے مشرف فرمانا شروع کیا + مگر ابھی کہ موصوف نے کتاب بند ہی کی تھی - ایک اسٹیشن آیا - اور ایک اور اُن کے ایک پتلون بھائی آن بان سے اس ڈبے میں سوار ہوئے + اب برادرِ ماقبل اور اِس برادرِ مابعد میں صرف ایک اخبار "پانیر" کا فرق تھا - یعنی یہ درجہ دوم اپنے ساتھ کہیں سے اخبار پانیر کا ایک پرچہ بھی اُٹھا لائے تھے + ہم تو اسی شش و پنج میں رہے - کہ انہیں بندگی یا سلام - مگر ان کی خوش تہذیبی ملاحظہ ہو - کہ ہم لوگوں کو سلام بندگی کیے بغیر آپ نے بیٹھتے ہی اخبار کا ملاحظہ شروع کر دیا - اور جیب سے ایک فینسی چھاپ سگریٹ کی ڈبیہ اور "لائٹس" نکال کر اپنے پاس رکھ لی - جس کا مطلب صاف یہ تھا - کہ ہم باقی چار مسافروں نے نہ کبھی اخبار "پانیر" دیکھا اور نہ فینسی چھاپ سگریٹ + آگ سی لگ گئی - فوراً اُٹھ کر ہم نے بھی اپنے بکس سے بیوی کٹ سگریٹ کا وہ ڈبہ نکالا جس کے اندر اماں نے ہمارے پانوں کے لئے چونا بھر دیا تھا - اور اوپر سے ایسا معلوم ہوتا تھا - گویا اس کے اندر سگریٹ ہی

سگریٹ بھرے ہوئے ہیں + بس یہ ڈبا نکال کر ہم نے قینچی چھاپ والے پتلونی بھائی کو دور سے دکھایا اور کہا۔ "سگریٹ ملاحظہ کیجئے" +

تھے آخر کو گوالیاری اپنی ڈبیہ لے کر فوراً ہمارے سامنے لائے اور کہا۔ "یہ سگریٹ بھی آپ ہی کا ہے" + ہم نے ڈبیہ لے کر کہا۔ "آداب"۔ پھر جو ان کے سگریٹ پینا شروع کیا۔ تو تمت بالخیر تک معاملہ پہنچا دیا۔ اور پتلونی بھائی صاحب کو ہم سے ڈبیہ واپس لینے کی جرأت نہ ہوئی۔ اور مارے سوالات کے ان پہلے والے صاحب کو کتاب پڑھنے کی مہلت نصیب نہ ہوئی + ہمیں بعد میں معلوم ہوا۔ کہ یہ پتلونی بھائی مسلمان تھے +

ساتھیوں میں ایک ایسے بزرگ بھی تھے۔ جن کی رکاب کے ساتھ ان کے کوئی شش سالہ طولعمرہ بھی تھے + ہندوستانیوں کا لاڈ پیار تو مشہور ہی ہے۔ اس لئے ہم نے ان کی شفقت دیکھتے ہوئے دہلی کے اسٹیشن پر ان کے طولعمرہ کی انگلی پکڑ کر کہا۔ "حضرت ہم آپ کے بچے کو مسافرانہ دنگل سے صاف اور سالم بچا کر لے جائینگے۔ تو کیا آپ ہمارا بستر اور صندوق قلی سے اتروا کر باہر لے آئینگے؟" فرمایا

"ھل جزاء الاحسان الا الاحسان"

اب ہم تو ان کے طول عمر کو ریل سے اُتار کر اسٹیشن سے باہر لے آئے۔ اور آپ بستر لے آئے ہم نے کہا ہمارا صندوق؟ تو گھبرا کر بولے اِنّا للہ وَ اِنّا! ہم سمجھ گئے۔ کہ مارے شرم کے عربی میں کہہ رہے ہیں۔ کہ صندوق بھول آیا۔ اُس وقت انگریزی حساب سے شبہ کے کوئی تیرہ چودہ بجے ہونگے۔ بس فوراً خیال آیا کہ ابھی ریلوے کا انتظام انگریز دل ہی کے ہاتھ میں ہے۔ لاؤ ووڑ کر تار دے دیں۔ صندوق مل جائیگا۔ اسٹیشن پر پہنچ کر اسٹیشن ماسٹر سہارنپور کو تار دیا کہ۔

"اس قسم کا۔ اس رنگ کا۔ اتنا بڑا"

"اس نمبر کی ریل میں۔ اس نمبر کے ڈبے میں"

"آرہا ہے۔ بحفاظت اُتار کر دہلی میں۔ اس نام پر

"اس ہوٹل پر۔ اس منیجر کی وساطت سے اور

"اس محلے میں پہنچے"

اتنی باتوں کا تار کے ذریعے کہنا تھا۔ کہ تار بابو نے تار کے فارم پر دو چار جگہ پنسل کو زور سے پٹک کر کہا۔ "چار روپے چودہ آنے کا ہوا" + ہم نے پانچ روپیہ کا سکہ نوٹ کہ نصف جس کا صرف کاغذ ہوتا ہے۔ نکال کر بابو صاحب کو جو دیا تو بابو صاحب نے رسید دے کر ہمیں سلام بھی کیا + ہم بابو صاحب کی

تہذیب اور اُس غیر متوقع خلق پر حیران رہ گئے - مگر فوراً ہی سمجھ گئے اور کہا کہ - "بابو صاحب اور وہ باقی کے دو آنے؟" تو ہنس کر فرمایا - "وہ تو ہمارا حق ہیں" +

اب جو اس معاملہ سے فارغ ہوئے - تو صندوق کی فکر میں بلند کیسے آئی تھی؟ اِس لئے دہلی کے ہوٹلوں کی مشہور روایات کے تجربے کے لئے ایک ہوٹل میں جا ٹھیرے +

رات کو صندوق کی گھبراہٹ میں تار گھر کے قریب مولانا محمد عرفان مجاہد اعظم سرحد و ناظم جمعیۃ العلماء خوش رنگ شیروانی پہنے ملے + چونکہ یارانہ بہت پرانا ہے - اِس لئے ہماری صورت دیکھتے ہی جھوم گئے - اور فرمایا - "چلو چلو گاڑی جا رہی ہے مجھے پانچ دن سرحد میں چلے جانے کی اجازت مل گئی ہے" + ہم نے بقدر پانچ دن مبارکباد کہہ کر فوراً کہا - کہ "اور جو ہمارا صندوق" - تو فرمایا - "تار دو تار - اور دیکھو صبح کی گاڑی سے جلد پشاور پہنچ جاؤ" + یہاں صبح جو ہوئی تو سہارنپور سے صندوق مع الخیر والعافیت واپس آ چکا تھا +

اُس وقت خیال آیا - کہ اگر آج کو ریلوے کا انتظام ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہوتا - تو اوّل تو رات کو وہاں اور کچھ وہاں ویسے ہی بند ہوتیں - پھر دوسرے دن بعد دوپہر

کہیں ہمارے صندوق کی رپٹ متعلقہ تھانے میں لکھی جاتی اور جو تھانے دار کسی مقدمہ کی تفتیش میں باہر گئے ہوتے۔ تو ایک ہفتہ تک اُن کی آمد کے انتظار میں ہمارے صندوق کی تحقیق ملتوی رہتی۔ پھر اثباتِ دعوے کے لئے صندوق کے بیعنی گواہ جہاں سے یہ صندوق خریدا تھا۔ اُس دُکاندار کی تصدیق جن لوگوں کے سامنے خریدا تھا۔ اُن کا حُلیہ اور گواہی۔ پھر ریل میں ہمارے قبضہ میں اس صندوق کو دیکھنے والوں کے نام لکھانا ہوتا۔ پھر تھانے کے منشی جی کی خدمت میں روزانہ حاضری اور سلام۔ پھر بھی تھانے دار صاحب اتنی ڈانٹ ضرور پلاتے:۔

"کیوں آپ اپنے مال سے بے خبر رہے؟ اب اُس کا ملنا محال ہے۔ کوشش کرونگا۔ آپ کو کن لوگوں پر شبہ ہے؟"

اب اگر ہم ساتھ سفر کرنے والوں کا نام شبہ میں بتا دیتے تو تھانے دار صاحب اُنہیں آگے کے اسٹیشن پر شبہ میں روک لیتے۔ اور وہ تا برآمدگی صندوق اپنے اپنے وطن پہنچنے سے محروم دہلی کے تھانے ہی میں دھرے رہتے ٭

اب جو صندوق مل جاتا۔ تو اس کا اور ہمارا چالان عدالت میں ہوتا + یہاں پھر گواہانِ ثبوت کے بیانات قلمبند ہوتے وکیل کیا جاتا۔ دو چار پیشیاں عدالت کی مصروفیت کی وجہ

سے بڑھ جاتیں۔ جس میں گواہوں کی خوراک ہم سے وصول کی جاتی۔ پھر کہیں عدالت سے ہمیں صندوق ملتا۔ تب بھی حاکم عدالت ہم سے اتنی بات زبانی کہہ ہی دیتے کہ

دیکھو جی آئندہ ایسی غفلت نہ کرنا۔ خبردار!

مگر یہاں صرف رات کے تیرہ بجے سہارنپور کے اسٹیشن ماسٹر کو تار دیا۔ اور صبح دس بجے پارسل بابو نے ایک رسید لے کر ہمیں یہ صندوق واپس کر دیا۔

اب ہم پشاور چلنے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ کہ یکایک ایک موٹر منہ کے سامنے آکر کھڑا ہوا اور اندر سے آواز آئی:

"اجی لالہ صاحب۔ کہاں کہاں؟"

ہم نے بھی گھبرا کر کہا۔ "پشاور پشاور!" تو فرمایا:

"اجی کہاں کا پشاور ادھر آیئے۔ اب کون جانے دیتا ہے۔ چلئے مشاعرہ میں۔ شاندار۔ علی گڑھ ہو رہا ہے"۔

یہ ہمارے وہی کرم فرما تھے۔ جو ادبیات اردو اور علوم اردو کے سرپرست اور ادبائے اردو کے محسن و کفیل ہیں۔ اس لئے زیادہ تکرار مناسب نہ سمجھی۔ اور موٹر میں بیٹھ گئے۔ پھر یہ خوشی بھی ہوئی۔ کہ اجلاس جمعیۃ کے لئے پشاور تک کے مصارف سے خدا نے بچایا۔ ننھے میاں کی والدہ کے تحفے کی خریداری سے خدا نے بچایا۔ ہندوستانیوں کی بھی

عمل میں نہ آنے والی تجویزوں کی تائید سے خدا نے بچایا۔ جلسے والوں کی روٹیوں کے احسان سے خدا نے بچایا۔ کسی لیڈر کے ساتھ کیمپ میں قیام کر کے اُن کے چندے کے مشوروں سے خدا نے بچایا۔ اِس لئے ہم نے بھی کھدر کا لباس اُتار کر عمدہ گرم انگریزی کوٹ پہن کر موٹر میں قدم رکھا + موٹر کے ہمراہیوں میں ایک صاحب ایسے بھی تھے۔ جو ہر سواری میں میل دو میل چل کر اونگھنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ مگر وہ جو کہا ہے۔

کہ ؎ بہر زیبی کہ رسید بیم آسماں پیدا +

ساتھی صاحب تو کچھ دُور تک اونگھ کر رہ گئے۔ اور ہم نے ہندوستان کے دیہاتی بھائیوں کی زندگی کا مطالعہ شروع کر دیا + چل پہ چل دہلی سے کوئی اڑھائی کوس ہی دُور گئے ہوں گے کہ گوڈر کی گٹھریاں باندھے۔ پھٹے پُرانے بیوند لگے ہوئے جیتڑے لگائے۔ اور کہیں کہیں ننگ دھڑنگ لوگ باگ نظر آئے + یہ گویا غریب مسافر لوگ تھے ؎

پھر کیا دیکھتے ہیں۔ کہ سڑک کے کنارے ہر پتھر کے میل کے پاس سینے سے لاٹھی لگائے۔ سرخ پگڑی باندھے کھڑے سو کھیا رہے ہیں + ایک قصبے کا بازار۔ ٹھنڈیوں سے آراستہ۔ پیلے عالم باغ نظارے۔ میلے لگے کپڑوں میں قطار اندر قطار اپنے اپنے نیچے میاں کو گود میں لئے ٹہل رہے ہیں۔ اور جھونپڑوں کے دروازوں

پرودہ یعنی "ننھے میاں کی والدائیں" بھی کھڑی ہوئی ہیں + ایک پل پر چند تاریک خیال دفتری لوگ باگ استری کئے ہوئے پاجامے پہنے اس طرح بیٹھے ہیں - گویا کوئی بڑی برات آرہی ہے - جس کے لئے یہ سب منتظر ہیں + معلوم ہوا کہ یہ تمام اہتمام اس لئے ہے - کہ ۶ بجے شام تک اس راستہ سے ایک افسر اعلےٰ اپنے دورے سے واپس ہونگے + ایک تھانے کے دروازے پر تھانے دار صاحب بڑے کرّ و فر اور بڑے دبدبے سے اکڑے ہوئے بیٹھے تھے - مونچھوں کو اس قدر تاؤ دے رکھا تھا - گویا سمرنا کی لڑائی میں یونانیوں کو آپ ہی نے بھگایا تھا - مگر وحشت اور مردم ناشناسی کا یہ عالم تھا - کہ ہمارا موٹر جو قریب سے نکلا - تو گھبرا کر یہ سب کھڑے ہو گئے + اس وقت ہمارے دل میں شرم محسوس ہوئی کہ ہم پہلے ہندوستان کے ان اصل باشندوں کو تو درست کر لیں - جو آج تک برسے اوڑھے ہوتے ہیں - پھر سوراج کا تقاضا کریں + تھوڑی دور آگے چند گاڑیاں ملیں - جن کے اندر خیمے - میزیں - کرسیاں اور گملے تھے + ان گاڑیوں میں اگر - مراد آبادی اگالدان اور نظر آجاتے - تو ہم سمجھ لیتے - کہ ضرور کسی والئی ریاست کا دورہ ہو رہا ہے +

رات کے کوئی آٹھ بجے ہم علی گڑھ میں داخل ہوئے - سڑکوں پر بجلی کی روشنی تھی - مگر جس سڑک پر سے ہم گزر رہے تھے -

اُس میں بجلی کا تیل کم ڈالا گیا تھا - اِس لئے روشنی اِس قدر میلی اور کم تھی - جیسے اپنے بڑے مولوی صاحب کے حجرے کی لالٹین + سڑکوں پر خاک اس قدر کہ اگر آگے کوئی گاڑی نکل جائے - تو دوسری گاڑی کو صاف راستہ نظر نہ آئے + یہ یو-پی کی مٹی کا قصور تھا - کمیٹی بے قصور ہے +

مشاعرہ اُس مکان میں ہو رہا تھا - جس کا نام بہت سیڑھی انگریزی میں ہے - اِس لئے ہمیں یاد نہیں رہا + دو رانوں تک مشاعرہ ہوتا رہا + جو لوگ ہندوستانیوں میں مشہور ہو چکے ہیں - یا ہونے والے ہیں - اُن میں سے سب سے پہلے ہم خاکسار ملّا رموزی صاحب - پھر ابو الاثر حفیظ جالندھری ایڈیٹر مخزن لاہور پھر مولوی بدر الحسن جلالی بدر بی - اے - ایڈیٹر اخبار مدینہ - اور پھر تو جناب سیماب اکبر آبادی - جنابِ صفدر مرزا پوری - جنابِ جگر مراد آبادی - جناب حامد سعید خاں حامد بھوپالی - جنابِ ساحر دہلوی - جنابِ اطہر ہاپڑی - جامع علی گڑھ کی سمت سے حضرت مولانا علی احسن صاحب احسن مارہروی حضرت رشید احمد صدیقی ایم - اے ایڈیٹر سہیل - حضرت پروفیسر حاذق ایم اے - حضرت جلیل احمد قدوائی بی - اے حضرت خواجہ مسعود علی ذوقی - بی - اے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اور ہاں وہ ساغر اکبر آبادی بھی تو تھے + مشاعرے کے

حالات چونکہ

"حسب فرمائش مولانا احسن مارہروی۔
باہتمام محمد مقتدے خاں شروانی۔
مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ سے۔
شائع ہونگے" + صدادب

شمالی ہند کے ادیب لبیب اور شیوا بیان شاعر حضرت حفیظ جالندھری اور جریدۂ فریدہ مدینہ بجنور کے چیف ایڈیٹر مولوی بدرالحسن جلالی بی۔اے کو ہم نے مشاعرہ کے اسٹیج پر پہلی مرتبہ جو دیکھا تو بے چین ہوگئے۔ کیونکہ ممدوحین گرامی سے رقمطرازی کے سلسلہ سے بڑی پرانی دوستی ہے۔ لیکن صورتاً وہ ہمیں نہیں جانتے تھے۔ اس لئے اسٹیج پر جاکر ان دونو سے آہستہ سے کہا:۔ "یہ ہیں ہم ملّا رموزی!"

بس یہ کہنا تھا۔ کہ برادرم حفیظ جالندھری تو مارے مسرت اور برادرانہ شفقت کے بے خود سے ہوگئے۔ اور کچھ ایسا ہی حال برادرم بدر جلالی ایڈیٹر مدینہ کا ہوا + مختصر یہ کہ اب جو ان ہم پیشہ بھائیوں سے معانقہ ہو چکا۔ اور ادھر مشاعرے میں حضرت حفیظ جالندھری نے اپنے سحر آفریں اشعار اور جادو اثر طرز سے جو عظیم القدر کامیابی حاصل کی۔ تو ممدوح کو ہر چہار سمت سے چاء اور روٹی کی دعوتیں آنے لگیں +

ہم نے موقعہ غنیمت جان کر برادرم حفیظ کا دامن تھام لیا - اور جہاں حفیظ صاحب چاء پر مدعو کئے جاتے ہم بھی اُن کے ساتھ اِس طرح چلے جاتے - گویا ہمیں سو ہزار خوشامدوں سے کسی نے اذن دیا ہے + خیر ہم پیشہ یا ہم ذوق ہونے کے لحاظ سے برادرم حفیظ کے ساتھ ہمارا بے اذن چلا جانا تو چنداں قابلِ اعتراض نہ تھا - لیکن شاعری کے ایک بڑے ہی "رنگیلے چلبتھڑے" تھے - جو نظموں کا ایک پلندا بغل میں دبائے ہر اُس مجلس میں تشریف لاتے تھے - جہاں حفیظ پسندوں کا مجمع ہوتا تھا + حاضرین دِل ہی دل میں ہنستے تھے - خیر یہ بھی کوئی ایسی معیوب بات نہ تھی - لیکن وہ کمال یہ کرتے - کہ جب حفیظ صاحب کوئی مؤثر نظم سنا چکتے - سامعین پر ایک کیفیت کا عالم ہوتا - تو یہ صاحب منمنائی آواز سے کہتے :-

"میں بھی ایک اور نظم عرض کرنا چاہتا ہوں" ÷

مُلاقاتیں بے ذوق - بد مذاق - ناقص تعلیم و تربیت والوں اور طرزِ تحریر کے صحیح مطلب و مفہوم کو نہ سمجھنے والوں سے ہم عید ہی کے دِن مل لیتے ہیں - پھر سال بھر بات نہیں کرتے لیکن جو لوگ کہ فطرت سے سلجھا ہوا ذوق اور خوش فہمی لے کر آئے ہیں - جو نرے پاپیر خواں ہی نہیں - بلکہ فارسی - عربی

علوم کے ساتھ ادبیاتِ اُردو کے بھی نکتہ شناس و رمز آگاہ ہیں۔
اُن سے ملاقات کے لئے جانا۔ معانقہ کرنا۔ رسم بڑھانا۔ اُن
کے ہاں چائے پی لینا۔ ہمارے ہی لئے کیا ہر بلاغت ربود اہلِ قلم
کے لئے قابلِ فخر ہے + پس ایسے مشاہیر میں علی گڑھ کے اندر
سب سے پہلے ہم نے ادبیاتِ اُردو کے دیرینہ محسن حضرت مکرم
مولانا سیّد سجاد حیدر یلدرم بی۔ اے رجسٹرار علی گڑھ یونیورسٹی کے
ہاں چائے کی ٹھیرائی + چار بجے کا وقت مقرر ہوا + مولوی
صاحب کی تیاریوں کا تو علم نہیں۔ البتہ ہم عینک اور
گاندھی کیپ سے مزیّن ہو کر بذریعہ موٹر کار جب ممدوح کی کوٹھی
پر پہنچے۔ تو ایک ترکی وضع کے مدبّر کو محوِ مطالعہ پایا + ہمارے
موٹر کی ہنگامہ گستری سے ممدوح آگے بڑھے۔ اور بڑے تپاک
سے معانقہ فرمایا + اب جو گفتگو ہوئی۔ تو خدا گواہ ہے۔ کہ سیّد
صاحب کے ہر فقرے سے خلوص۔ اخوۃ اور انکسار و تواضع
کے وہ اثرات نمایاں تھے۔ جواب صرف مشرقی مذاق کے بزرگوں
میں باقی رہ گئے ہیں۔ خلوص و شفقت کا یہ حال تھا۔ گویا قبیلہ
محترم ہمارے مضامین کے ملاحظہ کے بعد ہمیں اپنے سامنے
پا کر نہایت درجہ مسرور و شاداں ہیں + وحدتِ مذاق اور ہم
خیالی کے باعث ممدوح نے اکثر بار اُٹھ کر ہمیں موجودہ سیاسی
تحریکات کے متعلق متعدد کتابیں دکھلائیں۔ پھر دیر تک

کمالی سیاسیات پر گفتگو ہوتی رہی - اور لطف اس سے زیادہ آتا تھا - کہ ہر مسئلہ پر ہمارے اور ممدوح کے خیالات متحد ہو جاتے تھے + ممدوح کی انتہائی محبت کا اظہار اِس امر سے ہوتا تھا کہ آپ نے اپنی دو نایاب کتابیں - "حکایات و احتساسات" اور جلال الدین خوارزم" ہمیں تبرکاً عنایت فرماتے وقت ارشاد فرمایا - کہ

"میری اور کتابیں بھی ہیں - مگر میں آج ہی اِس لئے نہیں دیتا - کہ آپ ان کے سلسلہ سے میرے پاس پھر آئیں" ÷

خدا اُردو کے اس محسن اور بزرگ کو تا دیر سلامت رکھے - آئندہ ملاقات پر ارادہ ہے - کہ جس کرسی پر ہم بیٹھے تھے - اُس پر سیّد صاحب کو بٹھا دینگے - اور سیّد صاحب کی کُرسی پر ہم خود بیٹھ جائینگے - کیونکہ مہمان کو آرام کُرسی پر بیٹھنے کا ہر طرح حق حاصل ہے ÷

ہم اجنبی ہونے کی وجہ سے علی گڑھ میں پھرتے کیا تھے - خاصے مارے پھرتے تھے + اِس لئے ایک دن قبلہ مکرم حضرت مولانا ابرار حسین فاروقی بی - اے مولوی فاضل - پروفیسر و بینیات کے کُرسی خانے کی طرف جا نکلے + یہ دولت خانہ کی جگہ - کُرسی خانہ مولوی صاحب کی بکثرت کرسیوں کی نسبت سے عرض کیا ہے" + خدا زندہ رکھے اس تواضع کے مجسّمے کو - دوڑ کر جھوم

گئے - اور فرطِ محبت سے فوراً ارشاد فرمایا - کہ "شام کو کھانا یہیں کھایئے" + شام کو حاضر ہوئے - تو برادرم حفیظ جالندھری بھی ڈٹے ہوئے تھے + انہیں بہترین کھانے کھلائے - چاء پلائی - اور شب کے کوئی بارہ بجے تک وہی -

"ہاں حفیظ صاحب کوئی نظم!"

کا سلسلہ جاری رہا - اور حق تو یہ ہے - کہ حفیظ بھائی نظم کیا پڑھتے تھے وجد و کیف کے ساغر گنڈھاتے تھے +

ہم نے احباب کی فرمائش سے مشاعرہ پر بیٹھے بیٹھے ایک تبصرہ گھسیٹ دیا تھا - جو صرف احباب کی محفل میں پڑھ کر خوش وقت ہو لینے کے لئے تھا - مگر ایک صاحب زادے نے دہلی سے حضرت مولانا پروفیسر علی احسن صاحب احسن مارہروی کو لکھ دیا - کہ "وہ ملا رموزی نے مشاعرہ پر ایک مضمون لکھا ہے - اور اس میں آپ کی توہین کر ڈالی ہے" +

اس خبر سے مولوی صاحب قبلہ کے ایک "تلمیذ الرحمٰن عرف شاگرد" غصہ کے مارے بھنّا گئے - اور ہر چہار طرف منہ کر کے لگے کہنے - کہ

"بس تو اب ہم بھی -

اور

"بس تو اب ملا رموزی کو بھی -

اور

"بس تو ہماری پوری جماعت بھی۔

اور

"بس تو اخبارات میں بھی۔

اور

"بس تو اب بنا دینگے

اور

"بس تو اُنہیں سمجھا دینا۔

اور

"بس تو وہ ہوتے ہی کون ہیں؟" وغیرہ

شدہ شدہ موصوف کی یہ "بس تو" ہم تک جو پہنچی۔ تو ہمیں قبلہ احسن صاحب مارہروی کے تحمل پختہ کاری۔ اصابت ذوق اور ادب دانی پر جو اعتماد تھا۔ اُس کے سہارے مُسکراتے ہوئے قبلہ موصوف کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو ممدوح اپنے وقار کے لحاظ سے بے حد لطف و کرم سے پیش آئے۔ اور فوراً ہی فرمایا۔ میں تو حاذق صاحب اور رشید صاحب کو لے کر آپ کی قیام گاہ پر خود آنے والا تھا۔ مگر ہم نے فوراً اُس غلط فہمی کا تذکرہ کیا۔ تو مولانائے موصوف نے غصّہ سے فرمایا:۔

"اماں تم بھی لونڈوں کی باتوں میں آ گئے۔ بھلائیں اور

تمہارے کسی مضمون سے ناراض ہوتا۔ کیسی باتیں کرتے ہو؟"
قبلہ محترم کی اس غایت درجہ شفقت کے بعد ہم نے وہ اصل مضمون بھی مولانا کو سنایا تو مولانائے گرامی نے اپنی مسلّمہ ادب شناسی کے اثر سے فوراً مضمون ہم سے لے کر فرمایا "اب میں اسے اپنی مرتبہ رُودادِ مشاعرہ میں شائع کرونگا" ٭

اس قصّہ کے بعد شام کو ہم بغرض کسب فیض مولانا کے دولت خانہ پر حاضر ہوئے۔ تو بزرگانہ شفقت۔ خاطرداری اور بزرگانہ الطاف سے مولانا نے جس درجہ متاثر فرمایا۔ اس کے لئے دل و دماغ شناگستر ہیں + قبلہ محترم نے از راہِ غایت نوازش اپنا ایک بیش قیمت اُردو نسخہ دکھایا۔ جس میں ابتدائے اُردو سے اس وقت تک جتنے اسالیب تحریر ہیں اُنہیں ممدوح نے انتہائی کاوش اور تاریخی صحت کے ساتھ مرتب فرماکر زبانِ اُردو کا ایک عدیم المثال خزانہ جمع کردیا ہے اور جو عنقریب تاج دار دکن کی سرپرستی میں شائع ہوگا ٭

مولانا احسن مارہروی حقیقت میں بزم اُردو کے نہایت قدیم رکن اور داغ و امیر کی آنکھیں دیکھے ہوئے بزرگ ہیں + ممدوح کا ذوق جہاں خاص علمی و ادبی ہے۔ وہاں رنگِ محفل ہمیشہ اُن کے تابع رہا کرتا ہے۔ چنانچہ جب تک

بیٹھے موصوف کے علمی و ادبی لطائف کا وہ رُوح پرور سلسلہ
جاری رہا۔ جس کے اثر سے اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا +
یہاں ممدوح گرامی کے برادر زادے حضرت مولانا سیّد جان
صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل بی نے ہماری قلمی تحریر کا
ایک نمونہ تبرکاً لیا۔ اُس وقت ہمیں یہ غرور ہوا۔ کہ
"اخّاہ ہم بھی مشاہیرِ اُردو میں شمار ہونے لگے۔ جو
لوگ ہماری اصل تحریریں لے رہے ہیں + دیکھ لینا۔ ہمارا
جلوس نکلنے کے بعد یہ ہمارے خطوط کے عکس کو رسالوں
میں چھاپا کرینگے۔ معلوم نہیں اُس وقت تک تصویریں چھاپ
کر بیچنے والے رسائل بھی ہونگے یا نہیں؟"
یہاں بھی تبادلۂ کتب عمل میں آیا۔ اور ممدوح نے
ہمیں اپنی کتابیں "چُپ کی فریاد" اور احسن عطا فرمائیں +
یونیورسٹی میں ایک جماعت ہے جو ادبیاتِ اُردو کی
خدمت و ترقی کے لئے اپنی بہترین قابلیت سے کوشاں
ہے + اِسی جماعت کے نمایاں اور کامیاب ارکان میں
حضرت برادر مکرم جلیل احمد قدوائی بی۔ اے مصنّف "بہر
گُل" وغیرہ۔ حضرت برادرم خواجہ مسعود علی ذوقی بی۔ اے
حضرت برادرم خواجہ انصار احمد صاحب بی۔ اے حضرت
برادرم مولانا محمود الحسن صاحب بی۔ اے تھے۔ جنہوں نے

بیٹھے موصوف کے علمی و ادبی لطائف کا وہ رُوح پرور سلسلہ
جاری رہا۔ جس کے اثر سے اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا +
یہاں ممدوح گرامی کے برادر زادے حضرت مولانا سیّد جان
صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل بی نے ہماری قلمی تحریر کا
ایک نمونہ تبرکاً لیا۔ اُس وقت ہمیں یہ غرور ہوا۔ کہ
"اخّاہ ہم بھی مشاہیرِ اُردو میں شمار ہونے لگے۔ جو
لوگ ہماری اصل تحریریں لے رہے ہیں + دیکھ لینا۔ ہمارا
جلوس نکلنے کے بعد یہ ہمارے خطوط کے عکس کو رسالوں
میں چھاپا کرینگے۔ معلوم نہیں اُس وقت تک تصویریں چھاپ
کر بیچنے والے رسائل بھی ہونگے یا نہیں؟"
یہاں بھی تبادلۂ کتب عمل میں آیا۔ اور ممدوح نے
ہمیں اپنی کتابیں "چُپ کی فریاد" اور احسن عطا فرمائیں +
یونیورسٹی میں ایک جماعت ہے جو ادبیاتِ اُردو کی
خدمت و ترقی کے لئے اپنی بہترین قابلیت سے کوشاں
ہے + اِسی جماعت کے نمایاں اور کامیاب ارکان میں
حضرت برادر مکرم جلیل احمد قدوائی بی۔ اے مصنّف "بہرِ
گُل" وغیرہ۔ حضرت برادرم خواجہ مسعود علی ذوقی بی۔ اے
حضرت برادرم خواجہ انصار احمد صاحب بی۔ اے حضرت
برادرم مولانا محمود الحسن صاحب بی۔ اے تھے۔ جنہوں نے

محض ہمارے مضامین کے تعارف پر ہمیں یونیورسٹی میں چاہئے
پر مدعو فرمایا + گئے تو علاوہ اُن کے یونیورسٹی کے بکثرت اہلِ ذوق
طلباء موجود تھے - اور افسوس کہ ہم اُن حضرات کے ناموں
سے واقف نہیں + بہرحال ان حضرات نے قیمتی نوالہ اور انگریزی
مٹھائیوں کے ساتھ چائے پلائی - اور کوئی دو گھنٹہ لطفِ
کلام کا سلسلہ جاری رہا + دِل تو نہیں چاہتا - مگر کہے
دیتے ہیں - کہ یہاں بھی بھائی حفیظ جالندھری مدعو تھے +
دوسرے دن ان عزیز از جان بھائیوں نے ہمارا گروپ لیا +
حضرت جلیل احمد قدوائی سے علم ہوا - کہ وہ ہمارے مخدوم
زادے بھی ہیں + غرض خواجہ مسعود وتی - خواجہ انصار -
خواجہ محمود الحسن اور خواجہ جلیل احمد قدوائی کے خلوص محبت
اور نوازش کا جو نقش ہمارے دِل پر ہے - وہ ننھے میاں کی
والدہ سے لڑائی کے وقت کے سوا کبھی نہیں بھولا جائیگا -
خدا ان سب بھائیوں کو بامراد ہمارے ساتھ زندہ و سلامت
رکھے + یہاں بھی پٹنہ لائبریری کے لئے ایک بھائی نے ہماری
قلمی تحریر حاصل کی - جن کا نام افسوس کہ یاد نہیں رہا +
وہ جو دوسرے روز انہیں احباب کی طرف سے ہمارا اور
حفیظ صاحب کا گروپ بھی لیا گیا تھا - اس میں بھی الہ آباد
کے اُن دونوں میں سے ایک ہمارے شریک ہیں - کہ کہا ہے ع

"شاعری در گردنم اُفتاد بیدل چارہ نیست"

آخر میں دعا ہے ۔ کہ علی گڑھ کے احباب کو خدا سلامت رکھے ۔ اور ہمیں بھی + آمین ۔ خدا اُس جلیل القدر میزبان کو بھی خُوش اور زندہ رکھے ۔ جس کے معارف نواز الطاف سے ہم نے پشاور کی بجائے علی گڑھ دیکھا ÷

گھر واپس آئے تو فرمانے لگیں ۔ "لو دفتر میں تمہارے اوپر جُرمانہ ہو گیا ۔ اور جاؤ سفر میں!" فقط ÷

(از رسالہ + مخزن لاہور + مارچ ۱۹۲۸ء)

"سالگرہ عید نمبر" پر کچھ

انقلاب کے سالگرہ عید نمبر کا بہت انتظار کرنا پڑا ۔ عین عید کے روز عید گاہ جاتے ہوئے ڈاکخانہ گئے ۔ مگر عید نمبر نہ آیا ۔ اور ہم مُنہ بسورے عید گاہ چلے گئے + عید گاہ میں لوگ اپنے اپنے کپڑوں ۔ ننھے میاں کے کپڑوں ۔ صفوں کی برہمی اور قاضی صاحب کے اشد من الموت انتظار میں ہنگامے کر رہے تھے ۔ اور ہم تھے کہ گھٹنوں میں گردن ڈالے عید نمبر کے نہ آنے کے اسباب پر بحث کر رہے تھے + بارہا سر پیٹ لیا

Taj Tahir Foundation

گذرنے والے عید کے نمازیوں کے دیسی اور انگریزی جوتوں کی رگڑ سے ہماری تُرکی ٹوپی ہمارے سَر ہی پر کسی قدر ترچھی ہو ہو گئی ۔ مگر ہم فوراً ہی چونکتے ۔ اور پھر عید نمبر کے نہ آنے والے معاملہ میں غرق ہو جاتے ۔ اِسی طرح عید کی نماز کے بعد جب کوئی پڑھا لکھا سا آدمی ہم سے معانقہ کرتا ۔ تو آہستہ سے اُس کے کان میں کہتے ؎

"کیا انقلاب کا عید نمبر آپ کے پاس بھی نہیں آیا ؟"

غرض جب گھر پہنچے تو ننھے میاں کی والدہ کو دیکھتے ہی کہا۔ "کیوں جی وہ انقلاب کا عید نمبر تو ڈاکیا نہیں دے گیا ؟" اِس کا جواب اُنہوں نے چونکہ نہایت ہی عمدہ اور بہت ہی خوب دِیا اِس لئے نقل نہیں کرتے کیونکہ وہ تو کہا ہے نا کہ عقل والوں کو اشارہ کافی ہوتا ہے ۔ لہذا اب جو ہر طرح سے مایوسی ہو گئی ۔ تو اخبار انقلاب میں عید نمبر کے مضامین اور شان و شوکت کے لئے اس سے قبل جو اشتہار میں شائع ہوتا رہتا تھا ۔ اُسے ذہن میں تازہ کر کے ایک دیوار کے سہارے بیٹھ کر عید نمبر پر یوں اظہار خیال کرنے لگے ۔ کہ کہنی تو کھی گھٹنے پر اور سَر کے بائیں حصّہ کو ہتھیلی پر جما کر دِل میں کہا۔

جی ہاں ! وہ تو آج تمام لوگ اُسے ہاتھوں ہاتھ لئے پھر رہے ہونگے ۔ بے شک وہ عید نمبر تھا ۔ اِس لئے کس قدر عمدہ

چھپا ہوگا - اور اس وقت اُسے ہزاروں آدمی پڑھ رہے ہونگے
یا سنا رہے ہونگے - یا سُن رہے ہونگے - یا پڑھ بھی چکے ہونگے
یا سُن بھی چُکے ہونگے - اور اِس کی خوبیوں کے چرچے ہو رہے ہونگے
یا ہونے والے ہونگے - یا ہو بھی چکے ہونگے - واقعی حضرت مہر اور
حضرت سالک کو اخبار کا تجربہ بہت ہی خُوب ہے - اِس لئے
اُنہوں نے اسے بڑی ہی آب و تاب سے شائع کیا ہوگا - اور
اب ہزاروں دُعائیں لے رہے ہونگے - یا لے بھی چکے ہونگے +
اِس کی روشنائی نہایت چمک دار ہوگی - اور اس کا کاغذ نہایت
چکنا اور دبیز + اس کا سرورق نہایت نفیس اور رنگین ہوگا - اور
اس پر ہلال نہیں تو ایڈیٹروں کے نام کے طغرے بنے ہونگے
یا بن بھی چُکے ہونگے + اِس کے مضامین نہایت بلند پایہ ہونگے -
خاص کر ہمارے مضمون کا تو جواب ہی نہ ہوگا - اور اکثر لوگ یہ
کہہ رہے ہونگے کہ

"بس بھئی مُلّا رموزی صاحب کا مضمون پڑھ کر دام وصول
ہو گئے" +

اِس کی تصویروں میں خصوصیت سے مشرق کے فاتح اعظم
اور سیاست و حکمرانی کے اُستادِ اوّل حضرت مارشل مصطفےٰ
کمال پاشا کی تصویر ایسی ہوگی - جس سے یہ ثابت ہو رہا ہوگا
یا ہو بھی چکا ہوگا - کہ ایشیا اور اسلام کا یہی وہ بلند ہمت اور

صاحبِ فہم و فراست انسان ہے جس نے ایک سپاہی کی حیثیت سے سارے یورپ کو ذلّت اندوز شکست دی ۔ اور خود یورپ کو یہ داغ لگا ہے ۔ یا لگ بھی چکا ہے کہ اگر اس جنگ میں ترکوں کے "بادشاہ سلامت یورپ سے جیت جائے تو اتنی پرواہ نہ تھی ۔ جتنا رنج اس امر سے ہوا کہ مصطفےٰ کمال نے ایک سپاہی کی حیثیت سے سارے یورپ کو اوندھا کر دیا" +

پھر عید نمبر میں اشتہارات بھی کافی ہونگے ۔ جن میں عامل کریم الدین صاحب کا یہ اشتہار ضرور ہوگا کہ

"ساری دنیا کے عامل ایک جیسے نہیں ہوتے" +

اِس کے افکار و حوادث میں کسی مصنوعی پیر یا کسی مریدنی یا مریدن کا حال لکھا ہوگا (یہاں مریدنی بروزن شیرنی اور مُریدن بروزن دھوبن لایا گیا ہے) +

عید نمبر کی ہندوستانی خبروں میں سیّد برادران کا مقدمہ اور اپیل مسترد ہو گیا یا ہو گئی لکھا ہوگا ۔ اس کی برقیات میں شاہ افغانستان کے شاندار استقبال کی تفصیلات ہونگی + جن پر ہندوستان کے بیوقوف اہل قلم یہ رائے دینگے ۔ کہ بس جناب اب شاہ افغانستان عمر بھر ہندوستان پر حملہ نہ کرینگے کیونکہ وہ تھے پہلے معمولی سے آدمی ۔ مگر لندن میں جو استقبال

ہوا اُس سے وہ بادشاہت کرنا اور اپنی حکومت کو محفوظ رکھنا۔ یا جہاں گیری اور جہاں کشائی کے تمام اصول بھول گئے وغیرہ ۔

عید نمبر پر اس دل ہی دل میں رائے زنی سے دوپہر کا وقت تو کٹ گیا۔ اب شام کی ڈاک سے بھی عید نمبر نہ آیا تو پھر یوں سوچنا شروع کیا۔ کہ اجی یہ مہر و مہر اور سالک والک بڑے ہی مطلبی لوگ ہیں۔ بس اُنھوں نے تو ہم کو خط لکھ کر مضمون وصول کر لیا۔ اب اُن کی بلا سے ہمیں اخبار ملے یا نہ ملے۔ خیر کیا آئندہ وہ کبھی مضمون طلب نہ کریں گے۔ انشاء اللہ تعالےٰ ایسا روکھا اور خشک جواب دیا ہو کہ یاد ہی کریں ۔ اتنے میں ہمارے اور سالک صاحب کے دوست حضرت بشیر احمد صاحب رفیق امرتسری المعروف بہ بیمہ کمپنی نے آواز دی۔ باہر آئے تو رفیق صاحب نے فرمایا۔

"ملّا صاحب!

"الحمد للہ کہ میں اب سری نگر کشمیر میں بدل گیا۔ لیجئے کہا سنا معاف کیجئے۔ میں اس وقت کی گاڑی پر جا رہا ہوں۔ اور ہاں سالک صاحب کو کوئی پیغام دینا ہو تو مجھ سے کہہ دیجئے"۔

فوراً ہی تو کہا۔ کہ بس کہہ دینا کہ اگر آج کے بعد بات بھی کی ہے۔ تو حق میں اچھا نہ ہوگا۔ لاحول ولا اُمان وہ تو

بڑے ہی بے پروا آدمی ہیں + بھائی بشیر۔ آپ ہی انصاف کیجئے۔ کہ
یہ بھی سالک صاحب کی کوئی خوبی ہے۔ کہ انہوں نے میرے نام
عید نمبر بند کر دیا؟ یہاں عید نمبر میرے نام بند کر دیا پر بھائی بشیر
ہنس پڑے اور فرمایا۔ کہ نہیں نہیں ملا صاحب! عید نمبر آپ کے
نام ضرور آئیگا۔ میرے پاس تو آچکا اور اُس میں خدا کی قسم
آپ کے مضمون کو پڑھ کر میں دیر تک وجد کرتا رہا۔ یا کر رہی
چکا + چونکہ بھائی بشیر نے ہمارے مضمون کی تعریف کا سلسلہ
شروع کر دیا۔ اس لئے سالک صاحب کی طرف کا غصہ ذرا کم ہو گیا +
خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور ڈاکیا ڈاک لایا تو قریب تھا۔ کہ
عید نمبر پھر نہ دے۔ مگر اُس نے دوسرے اخبارات دے کر
کہا۔ کہ مولوی صاحب! ٹھیرنا۔ آج اشتہاروں کا ایک بنڈل
بھی آیا ہے + دیکھا تو "انقلاب" کا "عید نمبر" تھا۔ اس کے
لئے ڈاکیے صاحب سے کہا کہ آیندہ اخبارات کو اگر اشتہار کہو گے
تو اپنے حلقہ سے بدلوا دینگے + دروازہ کے باہر ہی کھڑے ہو گئے۔
اور "عید نمبر" کو دیکھنا جو شروع کیا تو اب ختم ہی نہیں کرتے۔
کبھی دیوار سے سہارا لیتے ہیں کبھی سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔
کبھی اسی جگہ بیٹھ کر پورا پڑھ لینے کے لئے ارادہ کرتے ہیں۔ مگر
شارع عام ہونے کی وجہ سے پھر گھر کا رُخ کرتے ہیں۔ غرض
دروازہ سے اندر جو داخل ہوئے۔ تو عید نمبر پڑھتے پڑھتے۔

Taj Tabir Foundation

اور چونکہ عید نمبر پڑھتے پڑھتے مکان میں داخل ہو رہے تھے آنکھیں
تھیں۔ عید نمبر۔۔۔ کی سطروں پر۔ اِس لئے دروازہ سے اس
زور سے ٹکرائے کہ ننھّے میاں کی والدہ مارے ڈر کے کمرے کے اندر
بھاگ گئیں + مگر اب جو ہم نیم غضب ناک صورت لئے اندر داخل
ہوئے۔ تو کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ کہا ارے تم تھے؟

غرض ان خانگیات سے جو فارغ ہوئے تو عید نمبر پر رائے
لکھنا شروع کیا + یہاں لفظ "خانگیات" میاں ساغر اکبر آبادی
کی کتاب "شبابیات" کے وزن پر لایا گیا ہے۔ پس اگر وہاں
لفظ شبابیات صحیح ہے تو یہاں بھی لفظ خانگیات صحیح ہے +
الغرض عید نمبر میں ہمیں جو چیز سب سے پہلے پسند آئی۔ اور
جس سے ہم بہت ہی خوش ہوئے۔ وہ یہ کہ ایڈیٹر صاحب نے
اِس کا پہلا ورق الٹتے ہی مضمون نگاروں کے نام لکھ کر اُن
کا شکریہ ادا کر دیا ہے۔ جس میں ہمارا شکریہ بھی خاص طور پر درج
ہے۔ اِس سے یہ ہوتا ہے۔ کہ مضمون نگاروں کا حوصلہ بڑھ
جاتا ہے اور اِسی لئے اب ہم نے تمام ایڈیٹروں کو لکھ دیا ہے۔
کہ ہمارے ہر مضمون پر ہماری تعریف کا ایک نوٹ ضرور لکھا
کرو۔ ورنہ کیا ہم مضمون کی داد قیامت کے دن پائینگے؟ اِس
پر بعض نے یہ چلتا ہوا آوازہ بھی کسا +

"پھر یہ تو ہوئی خود ستائی خود پسندی۔ شہرت پسندی

اور شہرت طلبی"؟

مگر ہم نے یہ لکھ دیا کہ ہونے دو جو بھی ہو۔ مگر تم تو تعریف لکھو۔ تو یہ سب کے سب منہ سا لے کر رہ گئے ؟

عید نمبر کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس کے مضامین کی متانت اور سنجیدگی بہت بلند ہے۔ فائدے اور ضرورت کے لحاظ سے اس میں مارشل مصطفےٰ کمال پاشا غازی ریف۔ مارشل رضا شاہ پہلوی۔ امان اللہ خاں غازی۔ اور ان کی تحریکات کے حالات تو اس درجہ موزوں اور مناسب ہیں کہ زبان تعریف ان کی تعریف سے قاصر ہے۔ کیونکہ ایسے ہی مضامین ہو سکتے ہیں۔ جن کے پڑھنے سے مردہ اور غلام قومیں نئی زندگی حاصل کر سکتی ہیں۔ پھر ان سب پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت والا مضمون تو اس درجہ قابل تقلید و احترام ہے۔ کہ باید و شاید۔ یہ مصطفےٰ کمال اور مارشل رضا شاہ پہلوی کے مضامین پر آج ایک صاحب نے فرمایا کہ

"اور گاندھی جی کی سوانح عمری کیوں نہ لکھی"؟

ہم نے انہیں ایسا جواب دیا۔ کہ بغیر سلام کئے گھر کے اندر چلے گئے +

ان تصاویر کی تہذیب و متانت بھی قابل قدر خوبی ہے ورنہ ڈر تھا کہ کہیں بمبئی کے اخباروں کی تقلید میں اس کے سرورق پر کوئی اشتہار یا تصویر بال صفا پوڈر کی شیشی نہ دے دی جائے + یا کسی تھیٹر کے ایکٹر صاحب یا ایکٹرنی صاحبہ کو نہ چھاپ دیا جائے۔ تصاویر

ہیں یہ خوبی خاص ہے ۔ کہ تمام تصاویر مردانہ ہیں "عورتانہ" نہیں + واضح ہو ۔ کہ لفظ مرد سے اگر مردانہ بن سکتا ہے تو ہیج سے لفظ عورت سے "عورتانہ" بھی بنا کریگا + پس اس قسم کی تصویروں سے شجاعت ۔ شہامت ۔ دلیری ۔ حوصلہ ۔ جفاکشی ۔ اور بہادری کے جذبات پیدا ہوتے ہیں ۔ یہ نہیں ۔ کہ مئی جان آگرے والی کی تصویر کے نیچے لکھ دیا ۔ شہید وفا ۔ اور کہہ دیا یہ ہے ۔" ادب لطیف" ۔ لاحول ولا !

اس کے ایسے ہی قابل تعریف مضامین ہیں " آیندہ جنگ" حکیم یوسف حسن صاحب ایڈیٹر رسالہ "نیرنگ خیال" کا ہے ۔ جس میں بڑی ترکیبوں سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ "آیندہ جنگ" ہو کر رہیگی حکیم صاحب اگر آیندہ بھی ایسے ہی مضامین لکھتے رہیں ۔ تو اُن کی بڑی شہرت ہو جائے اور یہ رسالہ نیرنگ خیال کے مضامین کو تو لوگ اتنا پسند بھی نہیں کرتے ۔ ایسے مضامین بہت مقبول ہونگے + اس مضمون میں حکومت روس کو اقدام کے ناقابل کہہ کر حکیم صاحب نے حربی واقفیت سے تجاہل عارفانہ فرمایا ہے ۔ پھر بھی مضمون بہت ہی پُر لطف و پُر مغز ہے ۔ غرض تمام مضامین بہت ہی خوب ہیں +

حصہ نظم میں ۔ مے مغانہ ۔ اے محبوب ۔ لطف سحر ۔ اور وہی اپنے حفیظ جالندھری کا ۔ عید کا گیت ۔ بہت عمدہ ہے + سفر آخرت

والی نظم ہمارے غور کے ہم نے نہ پڑھی۔ مگر ہوگی عمدہ۔ حفیظ جالندھری کے گیت کو کئی بار پڑھا تو حفظ یاد ہو گیا۔ مگر اتنا نہیں۔ کہ حفیظ صاحب کی بیاض سے اگر کہیں کھو جائے تو ہم لکھ کر بھیج دیں ؛

سب سے آخری مگر حیرت انگیز خوبی عید نمبر کی یہ ہے۔ کہ یہ عظیم الشان نمبر تین مہینے میں تیار کیا گیا ہے۔ جب مسلمان روزے نہیں کھاتے اور پانی بھی نہیں پیتے۔ بلکہ کچھ بھی نہیں کھاتے پیتے۔ یعنی ماہ رمضان میں جس کے دو معنی ہوئے۔ ایک یہ کہ یا تو ارکان "انقلاب" بھوک پیاس میں کام بہت زیادہ کرنے کے قدرتاً عادی ہیں یا پھر یہ لوگ کام اسی وقت عمدہ کرتے ہیں۔ جب انہیں بھوکا پیاسا رکھا جائے۔ پھر اس نمبر میں تمام مضامین کی یہ خصوصیت توجہ سے زیادہ عمدہ ہے۔ کہ اس کے تمام مضامین ہر مذہب والے کے پڑھنے کے قابل ہیں۔ فی الجملہ ہم اس عید نمبر کی اشاعت پر جس طرح ارکان "انقلاب" کو مبارکباد دیتے ہیں۔ اسی طرح سات کروڑ مسلمانوں اور ایک اور بیس کروڑ ہندوؤں کے نمائندے ہونے کے اعتبار سے ہم ارکان "انقلاب" کا شکریہ بھی ادا کرتے ہیں۔ جنہوں نے زبان اردو میں ایک ایسا نفیس عید نمبر شائع کیا۔ جو اس سے پہلے اخبار "پانیر" کی قوم والے ہی شائع کیا کرتے تھے ؛ خدا جانے اس کا ایک آدھ نمبر سائمن کمیشن والوں کے ہاتھ بھی آیا یا نہیں؟

اب تنقید کے صحیح قاعدے کے موافق ۔عید نمبر کی چند غلطیاں بھی بتلائے دیتے ہیں ۔ لہذا

پہلی غلطی اس کے کاتب نے یہ کی ۔ کہ ہمارے مضمون میں تین چار فقرے غلط لکھ دئے +

دوسری غلطی یہ کی کہ ہمارا مصرع تھا ؎

کر نوکر ۔نہیں تو ایڈیٹر سے ڈر

اسے لکھ دیا ۔ کر نوکر نہیں ۔ تو نوکری کے ڈر سے ڈر +

تیسری غلطی یہ کی کہ ہمارے نام کے آگے ہمارے خواہ مخواہ کے وطن کا نام بھی لکھ دیا ۔ جس پر ہمیں بے حد تاؤ آیا ۔ لہذا کہہ دیتے ہیں کہ ہم آیندہ "حج نمبر" میں کوئی مضمون نہ لکھینگے ۔ لوگ اس کے خریدار ہرگز نہ بنیں ۔ مگر ہاں یاد آگیا ۔ وہ سالگ صاحب پھر ہمیں ڈانٹ دینگے ۔ اور ہم ضرور لکھینگے ۔ یا لکھ بھی چکے ہونگے + انشاء اللہ

اخبار انقلاب لاہور ۸ اپریل ۱۹۲۸ء

افسانہ نمبر دیکھ کر

مکرمی وصل صاحب ایڈیٹر + مرقع لکھنو

آج حسب وعدہ آپ کے مرقع کا "فسانہ نمبر" ملا جسے میں "خطوط نمبر" بھی کہہ لیتا ہوں + مان لیجئے کہ میں نے عمر بھر میں پہلی مرتبہ مرقع کو دیکھا اور اسی لئے مجھے بے حد مسرت ہوئی - اور ساتھ ہی آپ پر کئی دفعہ غصہ بھی آیا - یہ کئی دفعہ اس طرح کہ جب رسالہ "مرقع" اس درجہ سلیم المذاق اور رفیع المنزلت ادبی پرچہ ہے - تو آپ نے اب تک کیوں نہیں میرے پاس بھیجا؟ پھر اس طرح کہ جب مرقع ادبیات اردو کے ایک مخصوص حصے (فسانہ) کا ناشر و حامل ہے - تو آپ نے میرے پاس کیوں بھیجا؟ کیا آپ نے مجھے بھی کہیں کا - "سارشن صاحب" سمجھ لیا تھا؟ دیکھئے یہ تمنا اور اعتراض گویا خاصی منطقی شکل کی عبارت ہے - جسے غور سے پڑھئے +

(۱) مرقع کے "افسانہ نمبر" یا فسانہ نمبر کی خوبیاں بہت زیادہ ہیں پہلی خوبی تو یہ ہے - کہ وہ جو لاہور سے رسالہ ہزار داستان - جاری ہوا تھا - اور اس نے اعلان کیا تھا کہ وہ فسانے ہی فسانے شائع کریگا - مگر دیکھئے کہ اب بند ہو کر رہ گیا میرے پاس

جو رسالہ نہیں آتا۔ میں سمجھ لیتا ہوں کہ وہ بند ہو گیا) تو اب ادبیات
اردو کے اس نہایت اہم اور مفید حصّہ کی ترقی کے لئے آپ نے
قدم اٹھایا ہے + واقعی بڑا کام کیا + مجھے یہ دیکھ کر بے حد
مسرت ہوئی۔ کہ آپ نے اردو فسانہ نگاری کے ذوق کو ارفع
بنانے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اور اس حساب سے آپ ہی پہلے ایڈیٹر
صاحب ہیں۔ کہ اپنی تمام توجہات صرف ایک مقصد کے لئے صرف
فرما رہے ہیں۔ جو کامیابی کی یقینی دلیل ہے + بہت اچھا کیا۔
کہ صرف ایک فن کے لئے مرقع کو مخصوص کر دیا۔ اور اسے خواجہ
حسن نظامی مدظلہ کا رسالہ "دین دنیا" نہ بنایا ÷

(۲) آپ نے "مرقع" میں ہر مضمون نگار کی تحریر کا عکس شائع
کیا۔ یہ بڑا اچھا کیا۔ اس سے مضمون نگاروں کا امتیاز کم ہو گیا۔ یعنی مشاہیر
اپنے سے کم مضمون نگاروں کی تحریر کے ساتھ اپنی تحریر دیکھ کر ذرا
جل مریں گے۔ کیونکہ غلام ہندوستانی مشہور ہو کر مغرور ہو جاتے ہیں
اور پھر بجائے خود لکھنے کے اپنے پندرہ روپیہ تنخواہ والے
"پرائیویٹ سکرٹری" سے خط کے جوابات لکھوایا کرتے ہیں۔ اور
اسی لئے تو برطانیہ انہیں سوراج نہیں دیتی۔ اور نہ دے۔ ہاں
ان تحریروں کے عکس سے مجھے بعض فسانہ نگاروں کی بد مذاقی
کا اندازہ ہو گیا۔ خصوصاً بھائی جلیل احمد قدوائی بی۔ اے اور
میاں احسن سبھی کی تحریر سے پتہ چلا۔ کہ ان جنانی خط والوں کے

مضامین لکھتے وقت بیچارے کاتبوں کی جان پر ہی آ بنتی ہوگی +
بعض تحریروں سے یہ اندازہ ہوتا۔ کہ ان کے لکھنے والے خود کو تھوڑا
سا بڑا آدمی بھی سمجھتے ہیں اور اسی لئے انہوں نے آپ کو نہایت
ہی مختصر جواب عطا فرمایا ہے + یہ خطوط میں مختصر نویسی آج کل
لیڈری کی علامت سمجھی جاتی ہے - اور اعلیٰ "قابلیت" کی سند +
چنانچہ آپ ایسے لوگوں کو مضمون کے لئے خوشامد سے بھرا ہوا طلسم
ہوشربا کی ساتوں جلدوں کے برابر خط لکھ دیجئے - وہ بڑی آن
بان سے صرف اتنا جواب دینگے کہ -

"بہت مصروف ہوں، معاف کیجئے" +

مگر میں اسی مختصر نویسی کو مشرقی آداب اخلاق کی توہین سمجھتا
ہوں - اور غلامی کی علامت، +

(۳) فسانوں کو میں کبھی نہیں پڑھتا۔ کیونکہ ان کے پڑھنے سے +
"ذرا عشق پیدا ہو جانے کا خطرہ" یقینی ہوا کرتا ہے + مگر "مرقع"
کا فسانہ "گوپال اور چرواہا" نوشتہ پروفیسر بابو رگھوپت سہائے
صاحب فراق - بی - اے کو میں نے بسم اللہ کہہ کر پڑھ بھی ڈالا -
جو بے انتہا عبرت آموز اور شائستہ ہے - میاں احسن سمجھی کے فسانے
"تین بجلیاں" کے اندر - "ریشمی ساری کا آنچل" پر جو نظر پڑی تو
گھبرا کر ورق الٹ دیا - کیونکہ اس میں وہی اوپر والا خطرہ محسوس ہوا
مگر زیادہ فسانوں میں عبرت آموزی - ہدایت اور اصلاح کے مقاصد

موجود معلوم ہوتے ہیں + جلیل قدوائی بی اے کا فسانہ "توشۂ مظلوم" میں نے اِس لئے نہیں پڑھا۔ کہ وُہ میرے بڑے اچھے دوست ہی نہیں بلکہ عزیز بھی ہیں۔ اِس لئے میں اُن کے ہر مضمون کو سمجھتا ہوں کہ لاجواب ہی ہوگا +

(۴) آپ نے ہندو بھائیوں کو مسلمانوں کے برابر فسانے لکھوانے کا اِنتظام تو ایسا بھی عمدہ کیا کہ زبان ستایش سے عاجز ہے اور اسی حساب سے آپ بھی ایک قسم کے ادبی مولانا محمد علی شوکت علی ہو جاتے ہیں۔ واقعی ملکی لحاظ ہی سے نہیں۔ بلکہ قومی۔ ادبی۔ علمی اور اخلاقی تعلقات کے لحاظ سے ہر ماہوار پرچہ میں یہ ضرورت یا اتحاد نہایت اہم اور مفید ہے + میں بھی ہندو بھائیوں کے حق اور حصّہ کو زبان اُردو پر تسلیم کرتا ہوں۔ بلکہ اُن سے شکایت ہے کہ اُنہوں نے اپنی اس مادری زبان کو کیوں صرف مسلمانوں کے قبضہ میں دے رکھا ہے۔ اور کیوں نہیں ہندو بھائیوں کو اِن مسلمانوں پر غصّہ آتا۔ جو زبان اُردو کو غیر ضروری عربی اور فارسی کا جامہ پہنائے چلے جا رہے ہیں + واللہ مجھے مسلمانوں کی حسب ذیل تراکیب "برقیّت۔ مقناطیسیت ساغر در بر۔ اور سیماب بدوش" کے مقابل بابو رگھوپت سہائے اور حضرت رامان گیان صاحب ایم۔ اے کے فسانوں کے یہ فقرے بھلے معلوم ہوتے کہ۔ "بھگوان تمہاری سرپرستی کرینگے"۔ "ہماری چنتا نہ کرو" + "اِس دیس

میں یہ بات شروع سے چلی آئی ہے" + "جو کچھ بدا ہوگا - ہو جائیگا"
"اُس کے بھاگ پھوٹے" +

"مہاراج مجھ سے بڑی خطا ہوئی" +

کیونکہ بھاشا یا پُرانی ہندو مُسلم زبان کے الفاظ سے ذوق جس قدر آ... چکا ہے اب اِن ٹیگوری تراکیب سے بڑی تکلیف ہوتی ہے اور ویسے بھی زبان کا حسن تباہ ہوتا ہے + پس اس کے لئے مَیں جس طرح مرقع کے ہندو ارباب قلم کا مدح گستر ہوں - اُسی طرح آپ کا شکر گزار + میں تو پھر ہندو بھائیوں سے کہتا ہوں کہ وہ آئین اور اپنی قدیم روایات کے موافق بھاشا اور روزمرہ کے سلیس اور عام فہم جملوں سے بجائے مسلمانوں کے اُردو کی شدھی کر ڈالیں جس کا خزانہ ہندو اُدبا کے انتخاب رنگین سے آج بھی جگمگا رہا ہے - مگر خُدا کے لئے اس جوش میں آکر کہیں اپنے افسانوں کے عنوانات نیج - سمّاچار - بھیشم - دیا آرمبھ اور بھکشا مُقرّر نہ کر دیجئیگا - ورنہ یہ مسلمان افسانہ نگار بھی اپنے فسانوں کے عنوانات - فتنہ - لغویہ - لمحۂ فکریہ - مقاطعہ جوعی بصائیر وعنبر - حوادث محلیہ وغیرہ رکھ کر اُردو کو غارت ہی کر ڈالینگے +

(۵) اب چند مشورے سن لیجئے + وہ یہ کہ اگر سال بھر میں ایک دفعہ یہ بھی ہو کہ تمام فسانے ایک ہی موضوع پر لکھوائے جائیں - مثلاً عید کے موقع پر مرقع کا "اتفاق نمبر" شائع کیجئے -

اور اس میں ہر فسانہ نگار سے عرض کیجئے - کہ وہ اتحاد کے فوائد پر" فسانہ لکھیں - پھر محرم پر انسانی ہمدردی پر سبق سے لکھوا کر محرم نمبر شائع کیجئے + پھر شب برات پر "حلوا نمبر" شائع کیجئے - مگر اس کے لئے مولویوں اور ملّانوں سے کچھ بھی نہ لکھوائیے - ورنہ وہ اس کے فوائد بہت تفصیل اور مذہبی دلائل سے لکھینگے - اور آپ کو خواہ مخواہ دو نمبروں میں یہ تمام مضامین شائع کرنا پڑینگے ÷

(۶) فسانے شائع کرنے سے پہلے صحت زبان کا لحاظ بھی دیکھ لیا کیجئے - تاکہ زبان کی غلطی نہ رہ جائے - کیونکہ فسانہ نمبروں بعض مضمون نگاروں کے مضامین میں زبان کی غلطیاں موجود ہیں + اس پر غصہ آگیا ہو - تو لکھ دینا - میں ان غلطیوں کو نقل کر کے بھیج دونگا ÷

(۷) وہ بولیں کہ "مرقع" میں تصاویر کا انتظام بھی ہو - تو اچھا ہے - آپ سمجھے ؟ مطلب یہ تھا کہ پھر "مرقع سے تصاویر پھاڑ کر تختے پر لگا دینگے + اور ان کے ننھے میاں طوطے مرہ ان سے کھیلا کرینگے + جب ہی تو ہم یہ ننھے کی ماؤں سے گھبراتے ہیں - مگر مرد اور تمام ادبی لوگ بھی کہا کرتے ہیں کہ صنف نازک مرد کے لئے بمنزلہ روح کے ہے - لاحول ولا ÷

(۸) ہاں میں نے آپ کو جو پہلے خط میں لکھا تھا - کہ میرے کسی خط کی عکسی نقل شائع نہ کیجئیگا - کیونکہ مجھے اس حرکت سے

سخت نفرت ہے - یہ دراصل غلط لکھا تھا + وجہ یہ تھی کہ اس سے پہلے
کے تمام خطوط پوری بے خبری اور گھبراہٹ میں لکھے تھے - یہ کسے
خبر تھی کہ آپ کے ہاں ہر ادنیٰ و اعلیٰ خط پر "عمل چغتائی" ہوا
کرتا ہے ؟ اس لئے مجھے خوف معلوم ہوا - کہ اگر میرے یہ بھونڈے
خطوط عکسی کر دئے گئے - تو لوگ ہنسیں گے - کہ ماشاء اللہ یہ
بھی کوئی ملا رموزی ہیں ؟ اماں ان کے خطوط سے تو معلوم ہوتا ہے
کہ یہ کوئی بہت ہی معمولی قسم کے آدمی ہیں + اور آپ کو
میرے پورے آداب القاب اور خطابات کا بھی علم نہ تھا -
لہذا آپ زیادہ سے زیادہ یہ لکھ دیتے - کہ " تحریر دست و قلم
ملا رموزی جعل شاہ " اور ظاہر ہے کہ اس سے عوام پر خاک
بھی اثر نہ پڑتا - اس لئے اپنے خط کی عکسی نقل کے لئے یہ خط
بھیجتا ہوں - اسے ضرور عکسی کر کے "مرقع" میں شائع کر دیجئے +

کہ می وصل شب ایڈیٹر مرقع

یہ تحریر کیسی سرور سے بھری ہوئی خط پڑھ کر دیے دل ہل رہے

ہیں یہ سب میں مصروف ہوں معاف کیجیے گا۔

ملا رموزی

اب تک آپ کے اس خط پر بیحد اضطراب تھا

تحریر دستخط و مہر حضور رضا دالملک ملا رموزی ایم اے

(آکسن)۔ مولوی فاضل ایم آر اے ایس

رئیس اعظم ..... (یہاں لکھنؤ کے کسی

بڑے تعلقہ دار کا نام لکھ دیجیے گا) والسلام

از رسالہ "مرقع" لکھنؤ مارچ سنہ ۱۹۲۸ء

Taj Tahir Foundation

لکھ کر اس خطرے سے بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ ہمارا یہ قول ہے کہ انسان کو بشرطیکہ وہ قوم کا جلاہا نہ ہو۔ ساری عمر میں ایک مرتبہ خواہ نخواہ بھی کسی خطرے میں خود کو مبتلا کر کے مردانہ قوت کو زندہ کر لینا چاہیئے۔ اس حساب سے وہ سوراج کے زمانہ میں تو زبان بندی۔ نظر بندی۔ سطح بندی۔ اخبار بندی۔ ایڈیٹر بندی۔ وارنٹ۔ چلکہ۔ ضمانت۔ گرفتاری۔ کوتوالی۔ حوالات۔ چالان۔ قرقی اور قید با مشقت کے خطرات سے اس ایک کی مشق ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن اب صرف احمد آباد گجرات میں کھدر کا پرچار باقی رہ گیا ہے اور بس +

ادھر اس میدانِ عمل و امتحان کی سرد بازاری کے بعد دوستوں میں ہیں سب کے سب بی۔ اے پاس۔ جنہیں بجز ٹھنڈی سڑک کی چہل قدمی کے کوئی شغل ہی پسند نہیں + تنگ آ کر ایک دن عزیز مکرم مولوی عبدالہادی انصاری صاحب سے کہا۔

"اماں لاحول ولا۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے زندگی ہے؟ کھایا۔ سو گئے۔ اٹھے اور ٹینس کھیل آئے۔ انسان وہ جو سپاہیانہ ہمت و حوصلے اور خطرے کی زندگی اور قربانی کے مشاغل سے دلچسپی پیدا کرے۔ یعنی

نخشت "

اُس وقت تو ہادی صاحب سن کر چپ سے ہو گئے۔ مگر

دل میں ٹھان لی تھی - کہ کسی دن مُلّا صاحب کو جفاکشی اور خطرے کی زندگی کا مزہ چکھا چھوڑیں گے +

عام قاعدہ ہے کہ بی - اے پاس مسلمانوں کو بغیر نماز پڑھے بھی ہر صبح کو پلنگ ہی پر چائے - بسکٹ اور انڈے ناشتہ کے لئے مل جاتے ہیں - اور جو ہوئے کسی اسلامیہ کالج کے تعلیم یافتہ اور کہیں کے "ذرا افسر بھی" تو پھر علاوہ ناشتے کے ایک سفید دروی والا ایسا خانساماں بھی مل جاتا ہے جسے ہر وقت یہ بھی کہہ سکتے ہیں - "ابے جا کام چور کہاں پکڑ کے نکال دونگا" - لیکن اُن کے لئے جنہیں علم و خرد کی احساس فزا دولت عطا ہوئی ہے اور جن کے دماغ کمال و معرفت کی روشنی سے جگمگا رہے ہیں - ہر نئی صبح مصیبت و اذیت کی کوئی نہ کوئی بلا لیکر آتی ہے - اور وہ اُن کی مدافعت میں اپنے دل و دماغ کی اُن برگزیدہ قوتوں کو صرف کرتے ہیں - جنہیں اگر کسی حکومت کے نظم و انصرام میں صرف کیا جاتا - تو دنیا ان لاجوابی پر عش عش کر اٹھتی + مگر ایسے ہی ارباب عقل و تمیز ہوا کرتے ہیں - جنہیں مسلسل مصائب و آلام کا سلسلہ مالیخولیا - دق - مراق - ضعف معدہ اور کبھی کبھی کھانسی کا تسلسل ختم ہی کر کے چھوڑتا ہے + اور کیوں جاتے ہو؟ ہمیں حفیظ جالندھری سالک بٹالوی - اور سیّد جالب دہلوی ہی کو دیکھ لو - آہ ایسے ہی مصیبت کے ماروں کو دیکھا گیا ہے - کہ وہ محض ردّ انکار

بابتلائے حواس کے لیے کبھی کبھی ایسے مشاغل کو بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ جو ان کی شان متانت و وقار کے یکسر منافی ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً ایک اخبار کا ایڈیٹر ہو کر افیون نوش بن جانا یا وہی علم لوگوں کو چھوڑ کر کالج کے طلبہ کو غزلیں سنانے جانا۔ پہروں وہیں پڑے رہنا۔ مگر ہمارے خیال میں انکار و حوادث کا مارا ہوا وہ انسان سب سے زیادہ ہمدردی کا مستحق ہے۔ جو بجائے کسی شغل و مرض کے دوستوں میں مبتلا ہو جائے۔ پھر وہ بڑی آسانی سے خطرے کی زندگی۔ مصیبت اور قربانی کے معانی و مزا اب سمجھ لینا ہے یا سمجھ لیتی ہے"

۱۴۔ مئی ۱۹۲۶ء کو طے کر کے ہادی صاحب تو رہے اپنے گھر اور برادرم لفٹنٹ نعمت علی خاں صاحب کو صبح کی اذان کے وقت ہمارے غریب خانے پر یوں بھیج دیا جیسے فحش نویسی کے سلسلہ میں کسی عدالت کا آدمی سمن لے کر مولانا حبیب کے گھر جائے۔ انہوں نے دروازے پر سے فرمایا "ملا صاحب! امان اٹھو تو! تو آخر کب تک کھڑے رہیں؟

"امان موزے پہننے کی کونسی ضرورت ہے؟"

"آ بھی جاؤ۔ ہاں ہاں یونہی آ جاؤ!"

"لاحول ولا۔ امان ذرا زور سے تو جواب دو۔ کیا کہا؟"

"خدا کی قسم مذاق نہیں - واقعی کام ہے"

"میں نے بھی تو منہ نہیں دھویا"

"اجی تو پان میرے پاس تو بہت کافی ہیں - بس تم تو شیروانی پہن لو - اٹھے بھی یا پلنگ پر سے ہی بول رہے ہو؟"

"اور جو وہ ابراہیم کہیں چلے گئے تو؟"

"میں نے کہا سنو ذرا جلد باہر آؤ!"

اماں عجیب آدمی ہو - بھلا یہ مذاق کا کون موقع ہے؟

لاحول ولا - کوئی احمق ہوا تھا - جو اتنے سویرے تمہیں اٹھانے آتا؟

"تو ذرا باہر تو قدم نکالو"

"اچھا اچھا تو لو جاتے ہیں - کافر ہی ہو - جواب تمہارے در پہ قدم دھرے"

"جی بس بس نہ آیئے - آرام ہی کیجئے"

بے تکلف احباب کا یہ وہ دوستانہ مارشل لا ہوا کرتا ہے جس کے مقابل کوئی نہیں جو ایک منٹ کے لئے بھی گھبیں بیٹھ سکے + آپ جو باہر آئے - تو خیر مقدم یوں شروع ہو جاتا ہے ÷

"وعلیکم السلام"

"شرم تو نہیں آتی؟"

"کیا افیون کھاتے ہو؟"

"اماں یہ کیوں نہیں کہتے - کہ وہ اجازت نہیں دیتی تھیں؟"
لاحول ولا قرآن کی قسم میری بیوی ہوتی تو دوست . . . . "
"اماں آخر اخلاق بھی تو کوئی چیز ہے!
"تو کوئی آپ کے غلام ہیں؟"
"اماں ملو ملو نہ ملو نہ ملو!
کیا کہا؟ خدا کی قسم ہر مرتبہ اتنا ہی جھنجھنا پڑتا ہے"
کوئی دولت تو دے نہیں دیتے ہو - بس اتنا ہی کہ مل لیتے
ہو ذرا طبیعت خوش ہو جاتی ہے"
اب جو ساتھ چل پڑے - اور راستہ میں آپ نے کہیں اتنا
ہی کہہ دیا کہ - "یار تمہاری جنجھٹ میں سگرٹ ہی بھول آیا۔
تو جواب ملیگا "اچھا تو اب بندہ تو ٹھہرنے کا نہیں" یہ کہا
اور صاف چل دیئے - لامحالہ آپ ضبط کر کے بغیر سگریٹ ہی
ساتھ ہو لیئے

یہ تو تھا لفٹننٹ صاحب کے دروازے پر آواز دینے کا
معاملہ - مگر ایسے مواقع پر یعنی دوستوں کے آواز دینے پر گھر میں
جو میدان جنگ قائم ہو جاتا ہے - وہ جاپان میں جاپانی افواج
کی زبردستی سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے - آپ تو پکارنے
والے مسلسل تقاضوں سے ہو جاتے ہیں بدحواس - لیکن اسی

پر "ننھے میاں کی والدہ" بھی قابو سے باہر ہو جاتی ہیں + اب جو آپ نے ضروریات کے لئے کوئی فرمائش کی - تو جوابات یوں ملینگے +

"تو کوئی خدا ہوں؟ مجھے کیا خبر؟ دیکھ لو!"

"وہیں کہیں میز کے پاس ہوگا (یا ہوگی)"

"مجھے کیا خبر ہوزے کہاں ہیں؟"

"تو کوئی میں تمہاری چیزوں کی چوکیدار ہوں؟"

"اور اب یہ نرکاری ورکاری کون لائیگا؟"

"تو اگر آج نہ جاؤ گے - تو کونسا خدائی قہر نازل ہو جائیگا؟"

"توبہ توبہ بیوی دوست کہیں فرشتے ہیں - کسی کل چین ہی تو نہیں لینے دیتے ہو"

"اچھا اچھا تو جو آپ کا مزاج چاہے کیجئے - ہمارا تو خود ہی جی گھبرا رہا ہے"

"تو تم سے نہ کہوں - تو اچھا کس سے کہوں؟"

غرض ان معرکوں سے فارغ ہو کر ہادی صاحب کے مکان پر پہنچے یہاں مجمع جائز کی حد سے بڑھا ہوا تھا - اور سب طرح کی ضروریات از قسم بستر کپڑوں کی گٹھریاں - تمباکو - پان - جھالیا اور دو چار بغیر لائسنس کی بندوقیں - یہ سب کچھ دیکھ کر ہم سمجھ گئے کہ سفر ہوگا سفر +

انضمنا نعمت علی خاں نہ فقط ہمارے علمی و ادبی کارناموں

کے قدردان ہیں۔ بلکہ وہ خلوص و ہمدردی اور اخلاص و محبت کے بھی مجسمے ہیں۔ اسی لئے وہ ہمارے مزاج سے بہت کافی واقف ہیں۔ لہذا ہمیشہ یہ کرتے ہیں کہ ہمارا غصہ شروع ہونے سے پہلے وہ الٹا ہمیں کو اس طرح ڈانٹ دیا کرتے ہیں۔ جس طرح اثبات جرم سے پہلے پولیس والے ہر آدمی کو ڈانٹ ڈپٹ تو تراق۔ گھونسہ وغیرہ مار دینے یا تان لینے کا حق رکھتے ہیں + مقصد یہ ہوتا ہے۔ کہ ہم غصہ ہونے سے پہلے اُن کی ڈانٹ سے اعتدال پسند ہو جایا کریں۔ لہذا تو ہی تو کہا در گذر سے کیا ہو۔ تم سے گھر پر اس لئے نہ کہا کہ اول تو تم اپنے گھر کے لوگوں سے اجازت نہ لینے کا بہانہ کرتے پھر کہتے کہ ابھی کپڑے دھوبی کے ہاں سے نہیں آئے ہیں۔ دفتر سے جاکر رخصت لینا ہے۔ اور آخر میں صاف گلہ دیتے۔ کہ بھائی ہمیں تو آج نہیں جا سکتا۔ اس لئے نہیں کہ تمہیں گھر سے آنے۔ اپنے غصہ کی کونسی بات ہے؟ سب چیزیں موجود ہیں۔ اور جو کچھ گھر کے بازار سے لینے چلینگے + چلو چلو اب غصہ وغصہ نہ رہنے دو۔ تو تم پان تو کھاؤ

دریافت کرنے پر بتلایا گیا۔ کہ یہاں سے گوالیار اور اگر موقع ملا تو گوالیار سے آگرہ بھی ہو آئینگے۔ وہاں تو بہت یہاں سے آج کل عمدہ ہوتے ہیں +

کوئی دسویں دن کو اس طرح تمام موٹر لاری میں سوار

ہوئے جس پر سفید رنگ سے لکھا تھا "موٹر سروس گوالیار - فی
کس ۴ عدد + "ٹکٹ خود ڈرائیور صاحب نے عطا فرمایا - جس
پر ہندی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا - اور ٹکٹ کا کاغذ مضبوطی
کے لحاظ سے اللہ بخشے اپنے دہلی والے بڑے حکیم جی کے نسخہ
نوش دارو کی طرح تھا + موٹر لاری میں مشکل سے کوئی پندرہ
آدمی کی جگہ تھی - اس وقت اس میں ۲۶ آدمی سوار ہو چکے تھے +
سواروں میں بھی اکثر بستر سمیت - البتہ بستر موٹر کی چھت پر یوں
رکھ دیئے گئے تھے - جیسے کسی بزرگ کے مزار پر راجہ صاحب
محمود آباد نے چار پانچ چھتے بنوا دیئے ہوں + اب یہ خالص
ہندوستانی سیل جو روانہ ہوئی تو کوئی تین میل پر ایک گڑھے سے
گزرتے ہوئے چھت پر سے دو بستر نیچے گر پڑے - اور ان کے لئے
موٹر تین منٹ ٹھیر گیا + آگے بڑھے تو ایک درخت کے سایہ میں موٹر
ٹھیر گیا - اور یہاں سے چار کسان سوار ہوئے + یہ گویا بغیر پان
بیڑی - پوری گرم - چائے ہندو - پانی مسلمان - دودھ گرم -
اور گاڑی تین منٹ ٹھیرنے کا اسٹیشن تھا + اب بلحاظ گنجائش
یہاں سے مسافر ایک کے اوپر ایک ہو کر سوار تھے +
صحرا کی گرم ہوا اور خاک نے ہمارے چہروں کی دیہاتی رونق
کو دوبالا کر دیا تھا - ایسا معلوم ہوتا تھا کہ افغانستان کی کسی
سرحدی چوکی سے آخر بدیوں پر بم باری اور گولہ باری کے لئے

کوئی ہندوستانی فوجی دستہ عجلت سے بھیجا جا رہا ہے + فرق صرف
یہ تھا کہ انگریزی پلٹن کے سولجر کے پاس ڈبل روٹی - سوڈا واٹر -
برف کمبل اور تپنجی چھاپ سگریٹ ہر حال میں ہوا کرتی ہے - مگر
ہم ہندوستانی سولجروں کے پاس اس وقت پانوں کے ڈبے - بیڑی
کے بنڈل - ماچس اور ہاتھ کے رومالوں میں موٹی موٹی روٹیوں کے بیچ
میں قیمہ گوشت تھا - پانی کا بندوبست اللہ میاں پر چھوڑ دیا تھا
گرمی اور لو کی شدت سے پسینہ ہندوستانی مزدوروں کے خون کی
طرح بہ رہا تھا + اب جو ہماری پیاس حد ادب سے بڑھ گئی - تو
ہم نے کہنی مار کر ہادی صاحب سے کہا کہ پانی ؟" تو جواب عطا
ہوا "مرے کیوں جاتے ہو آگے ندی آنے والی ہے" + کوئی ایک
گھنٹہ کے بعد ندی آئی - تو یہاں سایہ دار درختوں کے نیچے کوئی
پانچ کھدر کی چادریں بچھائے لیٹے ہوئے تھے + ہم لوگ تو پانی
پر ٹوٹ پڑے - اور یہ پانچوں کسان چادریں جھاڑ کر موٹریں نہایت
آن بان سے آکر بیٹھ گئے + پانی سے فراغت کے بعد جب ڈرائیور
صاحب سے اس "دخل در موٹر اداری" کی شکایت کی - تو انہوں
نے ان کسانوں سے فرمایا - "آجاؤ میرے پاس اس مڈگارڈ پر"
(یعنی پہیوں کے اوپر) + ادھر ہندوستانی قناعت پسندی ملاحظہ
ہو - کہ یہ کسان صاحبان - بے چون و چرا اس مڈگارڈ پر جا کر یوں
جم گئے - جیسے بمبئی میں ٹکس مہاراج کا مجسمہ نصب کر دیا گیا ہو -

اور جواب جنبش بھی نہیں کر سکتا + موٹر روانہ ہوا۔ اور اب سورج نے سامنے سے "دھوپ افشانی" شروع جو کی۔ تو پاس بیٹھے ہوئے کسانوں کے تازہ تازہ پسینے سے عنبر بار ہوائیں آنے لگیں۔ تھوڑی ہی دور گئے ہونگے کہ موٹر کے آگے کے پہیے میں پنچر ہوا۔ تو تمام مسافر سایہ دار درخت ڈھونڈ ڈھونڈ کر بیٹھ گئے۔ کھڑے ہو گئے۔ ٹہلنے لگے۔ اونگھنے لگے۔ سو گئے۔ باتیں کرنے لگے۔ چلم چھالیا کا مشغلہ شروع کر دیا۔ لیکن کسانوں نے یہ کیا کہ ڈرائیور صاحب کا محاصرہ کر لیا۔ کہ دیکھیں یہ پنچر کیا بلا ہے۔ اور اب کیا ہوتا ہے۔ ڈرائیور نے کسانوں کی اس تماشہ پسندی سے یوں فائدہ اٹھایا۔ کہ کسی سے کہا

"ابے کھڑا کیا ہے؟ جا وہ پتھر اٹھا لا!"

"ابے ذرا یہ چکا (پہیا) تو اٹھا!"

"ہاں ٹھونک ٹھونک۔ ابے زور تو لگا زور!"

"چل ہٹ گنوار کہیں کا!"

اس عرصہ میں ہم نے بغیر اس تحقیق کے کہ پانی یہاں سے کتنے میل دور ہے۔ تیمم کر کے ظہر کی نماز پڑھ ڈالی۔ تو ڈرائیور صاحب بولے۔ "مگر نماز سے نہیں چوکتے!" لیجئے گویا ہم نے بڑی حماقت کی۔ اتنا خوف باقی رہ گیا ہے اب مسلمانوں میں اللہ میاں کا + پھر ان سے توقع کرنا ایسا ہی ہے۔ جیسے مولانا اشرف علی تھانوی قبلہ سے یورپ و امریکہ کی سیاحت کی امید باندھنا + یہاں سے روانہ

ہوئے - تو پھر دو کسان ملے + انہیں بغیر کسی دلیل کے موٹر کی چھت
پر بٹھا دیا گیا - اور ان کی ضرورت مندی ملاحظہ ہو - کہ یہ بیٹھ گئے
صرف چھت کے اوپر کی سلاخوں کو دونوں ہاتھوں سے اس زور
سے پکڑے بیٹھے تھے - گویا اب انہیں موٹر میں کوئی کام ہی نہیں کرنا
یہ گر جانے کے خطرہ سے ایسا بندوبست کیا گیا تھا - ابھی موٹر
پوری رفتار سے چلی جا رہی تھی یا چلا جا رہا تھا - کہ یکایک ایک
طرف سے ایک عورت مع تین بچوں کے موٹر کی طرف جھپٹی یا جھپٹا
تو ڈرائیور نے اشارے سے کہا - "جگہ نہیں ہے جگہ" مگر جب موٹر
آگے نکل گئی - تو ہم ہندوستانیوں کے جگر پانی ہو گئے - اور سب
نے مل کر ڈرائیور سے سفارش کی - کہ جس طرح بھی ہو - اس عورت کو
تو سوار کر ہی لو - کیونکہ اس بیکس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے بچے
بھی ہیں (یہاں موٹر کی سابقہ گنجائش ملحوظ خاطر رہے) + اب یہ عورت
یوں سوار کی گئی - کہ اس کے تینوں بچے ہم ہمدرد مسافروں کی
گود میں تقسیم کر دیئے گئے - یہ کہہ کر - کہ لیجئے بھائی صاحب - اس
بیکس کی مدد کرنا +

اب یہاں سے وہ عظیم الشان خطرہ سامنے آگیا - جس کے خیال
سے ہندوستانی دل کانپ جاتا ہے - بدن پر رونگٹے کھڑے ہو
جاتے ہیں - حواس میں ترتیب باقی نہیں رہتی - بلکہ یہ لکھنؤ ہی

کرنکوے تو چکر کھا کر گر پڑتے ہیں +

اب سُن لیجئے - وہ عظیم الشان خطرہ یہ تھا - کہ ایک ذرا بڑی سی ندی آئی - جس کا پُل ایک طرف سے اِس طرح گر گیا تھا - کہ اُس پر سے موٹر گزرتے وقت احتمال تھا کہ کہیں موٹر نیچے نہ گر جائے + بس جناب اس ہولناک خطرہ کا نظر آنا تھا - کہ موٹر میں قیامت کبریٰ بپا ہو گئی :-

"نہیں نہیں - موٹر ہرگز نہیں گزر سکتا +"

"افوہ کس قدر خطرناک راستہ ہے !"

"کیوں جی ڈرائیور صاحب - جب یہ راستہ اِس قدر خوفناک تھا - تو تم نے پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا ؟"-

"اماں کیا سب کی جان لوگے ؟"

"ہم تو مر بھی جائیں - تو اس پر سے موٹر لے جانے کی رائے نہ دینگے +"

"اماں رہنے بھی دو - اور جو خدانخواستہ موٹر گر گیا تو ؟"

"خدا کی قسم ہڈیاں بھی نہ ملینگی +"

غرض خوف و ہراس اور دہشت و بدحواسی کا ایک طوفان تھا - جو ہر شخص کے دماغ کو معطل کر چکا تھا + اکثر نے یہی رائے دی - کہ اگر کوئی دوسرا راستہ نہیں - تو پھر واپسی ہی مناسب ہے + بعض نے نہایت قابلیت سے یہ رائے دی - کہ یہاں

سے ایسی سمت لے چلو جہاں سے کوئی ریلوے اسٹیشن قریب ہو۔ تاکہ ریل کے ذریعہ گوالیار پہنچ جائیں۔ کیونکہ بھائی کوئی جان دینا تو بدا نہیں ہے + آخر صاحب نہ ہوا ضبط تو کھڑے ہو گئے ہم ایک ہندو ٹیلے پر۔ اور ایک ایسی "جہاد انگیز" تقریر کی۔ کہ اگر ہمارے مخاطب اس وقت انگریز ہوتے۔ تو آگ میں کود پڑتے۔ مگر یہاں یہ اثر ہوا کہ خود ہمارے ساتھیوں نے بہ یک زباں کہا۔

"بے وقوف ہو گئے ہو۔ بھلا یہ بھی کوئی موقع ہے۔ ہمت کا؟ ہمت ہی دیکھنا ہے۔ تو دیکھو کسی موقع پر" +

گویا یہ تو ہمت کا موقع ہی نہ تھا!

پھر بھی ہم نے سوچ لیا تھا۔ کہ ایک صاحب علم کے نزدیک کسی جماعت کو "تابع کر لینا ہات ہی کونسی ہے۔ فوراً کہا کہ اچھا یوں کرو کہ موٹر میں سب سے پہلے بیٹھ کر اس جگہ سے ہم گزرتے ہیں۔ پس اگر ہم سلامتی سے گزر جائیں تو آپ لوگ ایک ایک ایک ہی کر کے آجانا + اس پر ایک حکیم الامت اور رئیس الاحرار بولے۔ کہ "اور کیوں صاحب جو ہمارے ہی نمبر پر موٹر جا پڑا تو؟" تو ہم نے بھی جھنجھلا کر زمین پر پٹک کر کہا:۔

"او صاحب جو اس شدید گرمی سے ابھی آپ ہیضے میں مبتلا ہو جائیں تو؟ اور پھر ابھی آپ بیہوش ہو جائیں تو؟ اور پھر ابھی مر ہی جائیں تو؟"

آخرکار پھر فوجی لوگ فوجی ہی ہُوا کرتے ہیں - چڑھ ہی تو گئے موٹر پر حضرت لفٹنٹ صاحب - اور فرمایا :-

"بس بس مُلّا صاحب رہنے دو ان سب بزدلوں کو - چلئے ہم آپ چلتے ہیں - اور جن صاحب کو جان عزیز ہو - وہ نہ آئیں" ٭

لفٹنٹ صاحب کے اِس حوصلے سے ساتھیوں میں بھی کچھ ہمت تو کیا شرم سی محسوس ہوئی - تو دو چار اور آگے بڑھے - اور اس طرح معہ ڈرائیور ۹ آدمی دنیا کے اس سب سے بڑے خطرے سے یوں گزر گئے - کہ بال بھی بیکا نہ ہُوا + جب اس کنارے پر پہلا قافلہ پہنچ گیا - تو دوسری مرتبہ بقیہ افراد بھی اس خطرے سے گزرنے پر تیار ہوئے - مگر یہ ہمت اور حوصلے سے نہیں - بلکہ اِس مجبوری سے کہ آخر جائیں - تو کہاں سے اور کدھر سے ؟ جب کہ گوالیار جانے کو اس کے سوا کوئی راستہ ہی نہیں ٭

اب جو خطرے سے بخیر و خوبی سب کے سب گزر آئے تب کہیں جمہوں پر مادری رونق آئی یہاں مادری رونق سے مراد اصلی رونق ہے + پھر وہ مبارک سلامت کا سلسلہ شروع ہُوا - تو ایسا معلوم ہوتا تھا - گویا پورے چین و جاپان کو فتح کر کے ابھی ابھی واپس آئے ہیں + کوئی نصف میل تک اسی "عظیم الشان خطرے" کا تذکرہ رہا ٭

"ہاں صاحب - بس خدا ہی نے خیر کی" ٭

"میں تو کہتا ہوں - کہ فرشتوں نے پر بچھا دئے تھے" ٭

"خدا کی قسم - جو ذرا موٹر کا پچھلا پہیا کھسک جائے - تو واللہ حضرت ہڈیاں نہیں ملتیں"

"مگر واہ مُلّا رموزی صاحب - حق تو یہ ہے - کہ آپ ہی کا کام تھا کہ آپ نے اس کشتی کو پار لگایا + ہاں صاحب پھر آپ صاحب علم ہیں اور ماشاء اللہ اور ویسے بھی افغانی خون کے آدمی ہو" +

اس کے بعد کچھ دیر دیسی سڑکوں کی خرابی پر تیز و تند تنقیدیں اور نکتہ چینیاں ہوئیں +

یہ ہیں وہ حضور ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس جلیل الشان قربانی کے متعلد - جس میں حضور گرامی علیہ السلام نے خدائے جلال و جمال کے حکم کی تعمیل میں جان سے زیادہ عزیز بیٹے کے گلے پر چھری چلادی تھی - مگر حوصلے اور ایثار کی قوت نے جواب نہ دیا - اور کیا ایسے بے شمار ہندی مسلمان نہیں ہیں - جو آج بھی فریضہ حج کو اس لئے ترک کئے بیٹھے ہیں - کہ جو جہاز ڈوب گیا تو؟ جو بدوؤں نے مار ڈالا تو؟ اور میدانِ حج میں پانی نہ ملا تو؟ اور زمانہ حج میں وطن میں کوئی عزیز مر گیا تو؟ مگر ایسے نہیں جو کہیں کہ ہم دریا میں گرتے ہیں - اگر پار ہو گئے تو؟ یہی وہ بے ہمتی ہے - جو طلبہ سے انٹرنس کے بعد تکمیل تعلیم کی قوت کو ضائع کر دیتی ہے - اسی سے تاجر تخفیف خسارے پر تجارت کا پیشہ ہی ترک کر دیتا ہے - اسی سے صنعت و حرفت کو ہاتھ

نہیں لگاتے ۔ غرض زندگی کا ہر شعبہ ہے ۔ جو جذبہ قربانی کے فقدان سے مضمحل ہو رہا ہے ۔ اور اسی قربانی کا دوسرا نام ہے ۔ حوصلہ ۔ اور کوئی شب کے گیارہ بجے گوالیار پہنچ گئے کہ کہا ہے +

مخزن کی سالگرہ

اخباروں اور رسالوں کے سالگرہ نمبروں پر ہمارے "ننھے میاں کی والدہ" کو بہت ہنسی آتی ہے ۔ جو اصل میں حیرت کا جاہلانہ اظہار ہوا کرتا ہے ۔ کیونکہ اب تک شریف عورتوں کی طرح وہ اتنا ہی سمجھتی ہیں ۔ کہ بس سالگرہ تو کہتے ہیں ۔ سال میں ایک مرتبہ صبح ہی صبح ننھے میاں کے نہلانے کو ۔ پھول پھول کے کپڑے پہنانے کو ۔ سرمہ اور کاجل لگانے کو ۔ مٹھائی تقسیم کرنے کو ۔ محلے کی ماں بہنوں کو جمع کر کے رات بھر گانے کو ۔ اور اگر ہماری نظر نہ پڑے تو کسی پرانی قبر پر چادر چڑھانے کو ۔ مگر اب جو انہیں اخباروں اور رسالوں کی سالگرہ کے معانی و مطالب سمجھائے ۔ تو بس اس قدر سمجھی ہیں ۔ کہ ہر سالگرہ نمبر سے تصاویر نوچ کر ننھے میاں کے کھیل کے لئے احتیاط سے صندوق میں بند کر لیتی ہیں ۔ اور ہم سے اطلاعاً کہہ دیتی ہیں کہ ۔

"وہ پڑا ہے تمہارا سالگرہ نمبر"

بوہاں الزام کی اس ادب سوز حرکت پر غیر محرم اشخاص کو لاحول ولا کہنے کا حق حاصل نہیں ہے) اس لیے جن رسالوں کو ہم دل سے چاہتے ہیں۔ اُن کے سالگرہ نمبروں کو محفوظ رکھنے کے لئے خاص کوشش کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ پھر بھی مخزن کا سالگرہ نمبر پانچ دن کے بعد ایک دوست ہی کے گھر سے برآمد ہوا۔ اور انہوں نے اس احسان سے دیا گویا بخط مستقیم وہ ان ہی کے نام لاہور سے آیا تھا + لیکن جو بیٹھے تو اُن کی آنکھیں آشوبی تھیں۔ اور کی "حکایت سے سو نہ سکے۔ اور مخزن پڑھ بھی نہ سکے + صبح سویرے چہل قدمی کے نام سے بستر سے جو بھاگے۔ تو ایک باغ کے کنارے بیٹھ کر اس طرح پڑھ ڈالا۔ گویا اسے ہم سے کوئی لے بھاگیگا یا لے بھاگنے والا ہے + بہرحال آپ سمجھ لیجئے کہ ہم نے رسالہ مخزن کا سالگرہ نمبر پڑھ لیا۔ ختم کر لیا۔ دیکھ لیا۔ یاد کر چکے اور پڑھ چکے۔ اس کی ایک ایک سطر پر غور کر لیا یا غور کر چکے۔ لہٰذا رائے لکھتے ہیں کہ

یہ سالگرہ نمبر بے حد نفیس اور عمدہ ہے۔ اور اس لئے کہ متانت سنجیدگی اور بلند معیاری کے اعتبار پر یہ رسالہ اگر خدا نہ سیدہ نہیں تو عمر رسیدہ ضرور ہے۔ اور جہاں یہ عرصۂ دراز سے ادبیات اردو کی قابل قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔ وہاں ایک نہایت سلیم و سنجیدہ ذوق کا ناشر و مبلغ

بھی ہے + اس کی نفاستِ ذوق کا ثبوت اس کے سرورق ہی سے
اس طرح ملتا ہے کہ باوجود سالگرہ نمبر ہونے کے اس کا سرورق
نہایت خواجہ حسن نظامیانہ ہے یعنی صوفیانہ + اس کے سرورق
پر بجائے گوٹے کناری کے پھولوں بیل کے ایک سنہری جدول
ہے - اور نصف سفید و نصف نیلی زمین - یہ نہیں کہ رسالہ کے
نام کا عربی خط میں طغرا بھی ہے - تو ایڈیٹروں کے ناموں کا
کتبہ بھی - جامع مسجد دہلی بھی بنی ہوئی ہے - تو پرچم ہلالی بھی +
ابن سعود کے شہر کی ایک کھجور بھی ہے - تو ملکہ معظم کا تاج بھی +
گویا رسالہ کا سالگرہ نمبر کیا ہوا خاصا بہاری کا بیل ہو گیا - یا ہمارے
قصبہ میاں "جن کی آنکھوں میں کاجل بھی لگایا جاتا ہے - اور
سر پر بھی - پیشانی پر ایک سیاہ نشان بھی ہوتا ہے - اور سر پر
گوٹے کی ٹوپی بھی - گلے میں بڑے موتی صاحب کے تعویذ بھی
ہوتے ہیں اور تاویلی بھی +

غرض نخلستان کے سالگرہ نمبر کے پہلے صفحہ ہی سے سنجیدگی کا
اظہار شروع ہو جاتا ہے + اب جو مضامین کی باری آتی ہے -
تو یہ نہیں کہ ایڈیٹر کی جانب سے - اعتذار بھی ہے اور شکریہ
بھی - صرف زرکثیر کا ارمان بھی ہے اور خسارہ کا نقشہ بھی -
معاونین سے التماس بھی ہے اور خریداروں سے اپیل بھی - اور
تو اور سالگرہ نمبر دیکھ صاحب سے یہ بھی نہ لکھا کہ خط و

Taj Tahir Foundation

کتابت کرتے وقت چٹ نمبر کا حوالہ ضرور دیں" اور نہ یہ لکھا کہ "مخزن میں اشتہار دینا کلید کامیابی ہے" ÷ اسی طرح اِس نمبر میں اشتہارات تو ہیں۔ مگر نہ اس قدر کہ شہر دہلی کا دین و دنیا کہیں اُسے۔ نہ اس درجہ۔ کہ پنڈی بہاؤالدین کا رسالہ صوفی کہیں جسے + صرف چند اشتہارات ہیں تو وہ بھی "فحش نگاری" کی زد سے بچے ہوئے۔ البتہ ان اشتہاروں میں مراد آباد میں مردہ زندہ ہوگیا۔ اور لاہور کے عامل کریم الدین کا اشتہار نظر نہ آیا ÷

اب سرورق اور اشتہارات کے بعد ۱۴۵ صفحات میں مضامین ہی مضامین نظر آتے ہیں۔ جس ورق کو دیکھو مضمون یا نظم سے بھرا پڑا ہے + علامہ یوسف علی صاحب کے ایک خط کو "پیغام" کہہ کر شائع کیا گیا ہے۔ کیونکہ علاوہ قابل ہونے کے وہ "بڑے آدمی" بھی ہیں + ہم تو ایڈیٹر صاحب کو اُس وقت منصف مزاج سمجھتے جب وہ علامہ یوسف علی صاحب اور اپنے سرشیخ عبدالقادر صاحب کے مضمون کو ہمارے مضمون کے بعد شروع کرتے + مضامین میں بڑی خوبی یہ ہے۔ کہ اِن میں تنوع ہے۔ اور اِسی سے مخزن کی ادبی خدمت گزاری کے معیار و مقصد کا قابل تعریف ثبوت ملتا ہے + بڑی خوبی یہ ہے کہ مضامین میں تحقیق اور استدلال کا کافی لحاظ رکھا ہے۔ مولوی محمد اسرائیل صاحب کا مضمون "جنوب مشرقی یورپ میں اسلام" بہت کام کا مضمون

ہے۔ مگر موصوف نے اس کو لکھا ہے پڑھا نہیں۔ کیونکہ اس کے صفحہ ۸۴
پر ریاست رومانیہ کی مجموعی آبادی کے لئے الفاظ اور ہندسوں میں صاف
لکھا ہے کہ وہ سترہ کروڑ پندرہ لاکھ تین ہزار نو سو بتیس ہے۔
(۱۷۱۵۰۳۹۳۲) اگر ایسا ہی ہے تو پھر اس حساب سے انگلستان
کی آبادی کئی ارب ہوئی۔ حالانکہ وہ کل چار کروڑ ہے۔ اگر یہ بھی
ممکن ہے کہ رومانیہ کی واقعی آبادی سترہ کروڑ ہی ہو۔ کیونکہ ہم بھی
تو بہت دن سے جغرافیہ وغیرہ بھول گئے ہیں ÷

برادرم حفیظ جالندھری کا افسانہ واقعہ کے لحاظ سے نہایت
درجہ نتیجہ خیز اور زبان کے اعتبار سے بے حد دلچسپ اور مفید ہے۔
اور یہیں یہ افسانہ اس لئے بھی پسند ہے۔ کہ اس میں "ان" کا تذکرہ
کئی جگہ کیا گیا ہے ÷

علامہ شبلی کی فارسی شاعری والا مضمون بھی بالکل نیا ہے۔ اور
یہ مضمون اس لئے غنیمت ہے کہ ہمارے زمانے کے ایک واقف
یا عہدِ حاضر کے ایک مستند اور فاضل اہلِ قلم کو نوجوان دنیا نے یاد
تو کیا۔ ورنہ یہاں تو جب حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ غالب و مومن
ہی کی بوسیدہ اور دراز زمانہ شاعری کی۔ اور عہدِ حاضر کے
بیچارے شعرا اور ارباب قلم ان لوگوں کے مقابل چاہے مصری کی
ڈلیاں کیا قند کے ہزاروں من تھیلے کھول کر رکھ دیں۔ مگر اُن پر
کوئی کچھ لکھنے کے لئے تیار ہی نہیں + کوئی ان سے دریافت کرے

کہ آخر غالب و مومن کے زمانے کی نثر تحریر جس طرح آج آپ کے لیے بیکار سی ہو کر رہ گئی - تو ان لوگوں کی شاعری کے سوا آپ کو کوئی عہد حاضر کا ایسا شاعر کیوں نہیں مل جاتا جس کی شاعری پر آپ کچھ لکھ کر اس کا حوصلہ بڑھائیں ؟ مگر جب کسی قوم کی ذہنیت ہی برباد ہو چکی ہو تو اسے کون سمجھائے ؟ امید ہے کہ آئندہ لوگ غالب و مومن - انیس و دبیر - میر و درد اور داغ و امیر کو چھوڑ چھاڑ کر ہلاری سوزی حسرت موہانی حفیظ جالندھری - تلوک چند محروم - یاس عظیم آبادی - جگر مراد آبادی - عزیز لکھنوی اور ہری چند اختر وغیرہ کی شاعری پر مقالے - موازنے اور تبصرے لکھا کریں گے کیونکہ عہد حاضر کے یہی وہ ارباب سخن ہیں - جن سے ہمارے دور کی زبان کو خاص عادت ہے + دیکھنا ہماری اس تحریر سے غالب پسند طبقہ کیا بھنائے گا +

سالگرہ نمبر میں یہ خوبی ہے - کہ اس کے جملہ مضامین کی زبان نہایت سادہ - سلیس اور عام فہم ہے + اس میں یہ بھی نہیں کہ ایک حصہ مضامین کو صرف "عورتانہ" کر دیا گیا ہو - جس کا اہتمام بقول رسالہ نور جہاں امرتسر "کلیم نسوانی ہاتھوں میں ہو" یہ لفظ "عورتانہ" امرجانہ کا جواب ہے - تو اہل قلم نوٹ کر لیں + اور ہاں مضامین کے اندر اکبر آبادی ادب لطیف بھی نہیں ہے جس کا نتیجہ کبھی کچھ نہیں نکلتا - صرف ڈیوٹی - مقتضا طبیعت

پرتیبھا - صاعقہ پاشی - ارتعاشِ منجمد - اور علی گڑھ میں دیوان دربر - اور شیر دلی بردوش ایسے الفاظ لائے جاتے ہیں - مگر سائگرہ نمبر کے جملہ مضامین بڑی آسانی سے علی گڑھ والے پڑھ سکتے ہیں - صرف بنگالی طلبا کہیں کہیں اٹک جائینگے - کیونکہ وہ تو اخبار "نئی دنیا" تک کو نائی دھنیا کہتے ہیں + سائگرہ نمبر کا حصہ نظم بھی نہایت مختصر مگر معنی آفرین ہے - اور غنیمت ہے کہ تمام نظموں کے ساتھ تصاویر کا اہتمام نہ کیا گیا + حفیظ صاحب کا پریت کا گیت - فلوک چند نرودم کی سر جھکائی ہوئی کلپاں - تیش کا حسن نظر ہری چند اختر کے دو شعر بہت خوب ہیں + بس "عطیہ فلاں" "غیر مطبوعہ" اور اکبر آباد کے شاعر اعظم کی کمی ہے ٭

تصاویر کا انتخاب ایڈیٹر کے جذبات اور حسن نظر کا نمونہ ہے + محبت والی تصویر کی عمر بہت کم ہے - اس کی عمر بھی شبلی علیہ الرحمتہ کے برابر دکھائی جاتی تو بیسوں تصویریں ہم عمر ہو جاتیں + پھر بھی تصاویر میں عریانی کی جگہ بے حد شائستگی اور تہذیب موجود ہے - یہ نہیں کہ نئی جہان آگرہ والی کی تصویر کے نیچے لکھ دیا - "جوانی اور کبھی سینہ پر بہہ میں کے نیچے "ایک نظر" + عمل چغتائی والی تصویریں چونکہ بقول حضرت سالک بیتالوی پھر آنکھیں بند ہیں - اس لئے کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی ٭

مضامین نگاروں کی تعریف تو کی گئی ہے - مگر نہ ایسی کہ رسالہ

خیالِ جاناں کی طرح مضامین نگاروں کا ایک جھنڈا ہی بنا دیا گیا ہو + ہمارے مضمون پر نوٹ لکھا ہے۔ مگر اس میں ہماری تعریف بہت کم ہے۔ اب دیکھ لینا حفیظ صاحب غصّہ میں آکر ہماری تعریف میں نہایت طعن آمیز نوٹ لکھینگے ÷

فی الجملہ مخزن کا سالگرہ نمبر اس قابل ہے کہ اُسے ہر پڑھا لکھا خرید ے۔ اور سالگرہ نمبر کی اس بے نظیر ترتیب پر ہم اس کے مضمون نگاروں۔ اس کے کاتبوں۔ اس کے منیجر۔ اس کے معاون ایڈیٹر کو داد دیتے ہیں۔ اور ڈاک خانے والوں کے اس ضبط کی تعریف کرتے ہیں۔ کہ اُنہوں نے مخزن کا کوئی سالگرہ نمبر نہیں چرایا + رہ گئے حفیظ صاحب۔ تو ہم اُن کی اتنی ہی تعریف کرینگے۔ کہ وہ ہر سہ ماہی پر ایسا ہی عدیم النظیر سالگرہ نمبر شائع کیا کریں ÷

بعض باتیں اس نمبر کے متعلق بھول گئے ہیں۔ جو انشاءاللہ پھر لکھینگے + ہاں شیخ سر عبدالقادر صاحب کے مضامین کو درمیانی صفحات پر شائع کیا جائے۔ اور کسی غریب مضمون نگار کا مضمون صفحہ اوّل پر شائع ہوا کرے۔ تو اس سے مضمون نگاروں کے حوصلے بڑھینگے۔ کیونکہ شیخ صاحب تو پھر اپنے ہی شیخ صاحب ہیں کہ کہا ہے ؎ گر قبول افتد یہ مشورہ زہے عز و شرف ÷

(رسالہ مخزن لاہور۔ جون ۱۹۲۸ء)

ٹورنامنٹ

ہندوستان جہالت نشان کے لئے ہندو بھائیوں کی طرح یہ انگریز بھائیوں کا دم بھی غنیمت ہی ہے - ہر سال کوئی نہ کوئی کھلونا ایسا بنا دیتے ہیں - جس کے شغل میں پڑ کر ہندوستانی اپنی دولت اُن کے گھر منی آرڈر کرتے رہتے ہیں! اور پھر خوبی یہ کہ اس کھلونے کو خرید کر ہندوستانی خوش بھی ہوتے ہیں ٭

چنانچہ آج کل "ٹورنامنٹ" کی ایجاد ہوئی ہے + اس میں یہ ہوتا ہے کہ کئی ہزار ہندوستانی ٹورنامنٹ میں شرکت کے لئے ریل والے انگریزوں کو کرایہ ادا کرتے ہیں - جس کی سالانہ تعداد کئی لاکھ روپیہ سکہ کلدار تک پہنچتی ہے + ٹورنامنٹ کے لئے انگریزی کپڑے بنواتے ہیں - جن کی مجموعی قیمت کئی کروڑ تک پہنچتی ہے - اور نفع صرف اتنا ہوتا ہے - کہ ٹورنامنٹ میں شریک ہو کر تفریح فرما لیتے ہیں اور بس! شاید اسی لئے یہ ویلو بنڈ والوں نے اپنے ہاں نہ ہاکی رکھی - نہ فٹ بال - نہ کرکٹ - نہ ٹینس - بس یہ کہہ دیا - کہ مدرسے چھٹی کے بعد بھی کسی پُر فضا مقام پر لے بیٹھو موٹی موٹی کتابیں - اور کرتے رہو بحث مباحثہ - تاکہ تازہ رہے علم - کیونکہ علم "دریا" ہوا کرتا ہے ٭

مگر ہم اس سوویشی تعلیم سے پہلے ہی خوش نہ تھے - اس لئے خدا بخشے "بڑے مولوی صاحب" کے انتقال کے بعد ہی ہم نے ندوۃ العلماء لکھنؤ سے اسلامیہ کالج میں تبادلہ کرا لیا - اور گو اسلامیہ کالجوں میں بھی "ہیڈ مولوی" ہوا کرتے ہیں - مگر ان کا عظم دین اتنا ہی ہوا کرتا ہے - جتنا بی اے میں عربی اور فارسی کورس - اور اسی لئے تمام بی اے پاس ہیڈ کلرک تو ہو جاتے ہیں - لیکن کبھی قاضی یا مفتی ہوتے نہ سنا! بہرحال ہمارے اسلامیہ کالج کے ہیڈ مولوی صاحب یوں بھی "خلافت" کے جلسوں میں جانے سے منع فرمایا کرتے تھے - اس لئے چھٹی کے بعد بڑی آسانی سے ہاکی اور فٹ بال کی مشق کر لیتے تھے - اور وہ جو کہا ہے کہ

قطرہ قطرہ آپس میں مل جاتا ہے دریا

سو تھوڑے ہی دنوں میں وہ ہاکی میں طاق ہو گئے - اور اب ہم اسے پاس کرنے کے بعد سے آج تک اس "ہاکی" کا یہ فائدہ ہوا ہے کہ سال میں چھ ماہ گھر سے باہر رہتے ہیں - اور جب تک "ٹورنامنٹ" میں رہتے ہیں - "منے کی اماں" کے اس تقاضے سے محفوظ رہتے ہیں کہ "خرچ ہو چکا!"

الغرض طے پایا کہ ۲۴ و ۲۵ کو ہماری ہاکی ٹیم - لکھنؤ کے "لال امرت رام لال ہاکی ٹورنامنٹ" میں شریک ہوگی - اور فی کس مبلغ ۲۵ خرچ ادا کرنا ہوگا! آپ ہی بتلائیے کہ پچیس روپیہ لکھنؤ

ایسے شاہی شہر کی سیر ایسا کہاں کا گراں قیمت سودا تھا؟ لہٰذا خوشی خوشی گھر آئے۔ اور "منّے کی اماں" کو ذرا علیحدہ بلا کر کہا۔

"ہم ۲۴ کو لکھنؤ جا رہے ہیں۔ صرف ۲۵ روپیہ دے دو۔ ایک ہفتہ میں لوٹ آئینگے" اور سنو۔ تمہارے لئے لکھنوی بالیاں بھی لیتے آئینگے۔ ذرا اللہ بہت ہی کمزور ہوتی ہیں!"

یہ "بالیوں" کا شوشہ اس لئے تھا کہ وہ زیور کا نام سن کر نرم ہو جائیں اور ہمیں سفر خرچ عطا فرمائیں۔ مگر نہ پوچھئے روپے کا نام سن کر ان کا کیا حال ہوا! چہرہ تو مغرب کے وقت کا پھولا ہوا شفق بن گیا۔ آنکھوں کی سرخی پر خون کا شک ہونے لگا۔ اور غصہ کا یہ عالم کہ کوئی تین منٹ تک تو ہمیں گھورتی رہیں پھر بولیں تو یوں کہ۔

"تمہارا لکھنؤ جانے ۔ ۔ ۔ ہیں! یہاں تو یہ حال ہے کہ "منّے کی کھانسی کسی طرح کم نہیں ہوتی جمیلہ کا بخار ہے کہ جانے کا نام نہیں لیتا۔ دو مہینے سے گلاب جامن کی قسطیں ادا نہیں ہوتی ہیں۔ زیور ہے کہ سود میں گھل رہا ہے! میری ایک جان ہے "کیا کروں!"

"منّے کی اماں" کا یہ دو ٹوک جواب تھا۔ جو آج ہر "منّے کی اماں" اپنے "منّے" کے ابا کو روپیہ طلب کرنے پر وقت دیتی ہے لیکن

ہم کوئی پرانے فیشن کے "ننّے کے ابّا" تو تھے نہیں - اِس لئے سگرٹ کو ہاتھ سے پھینک کر کہا۔ "سعد جی! آخر تم ہماری "نیک بخت" ہو یا مشیر مال؟ جو پچیس روپلی دینے میں اِس طرح ڈانٹ ڈپٹ - غصّہ - دھمکی - ترش روئی - تلخ گفتاری - تُند مزاجی - کجروی - کج خلقی - بے مروّتی - طعن - ملامت - نصیحت - وعظ - تنبیہ - تخویف - جھونج اور تشدّد سے کام لے رہی ہو! تو پھر اِس حساب سے تو ہم تمہارے ننّے کے ابّا کاہے کو رہے - خاصے عبد اللہ ملازم ہو گئے!" ——— مگر صاحب لاکھ ڈانٹو وہ پھر "ٹھیرے" - "گھر کے لوگ" - اور جن بھائیوں کو آج "گھر کے لوگ" حاصل ہیں - وہ ان کی چالوں سے خوب واقف ہیں! ادھر بھائی "ننّے کی اماں" سے ہمیں یوں بھی محبّت ہے کچھ کچھ - اور اُن سے ڈرتے بھی ہیں کچھ کچھ دیکھا تو آنکھوں میں آنسو بھر لائی تھیں - نہ رہا گیا - اور پھر سگریٹ اُٹھا کر کہا ؎

"اچھا اچھا رہنے دو اپنے پچیس روپیہ - ہم یوں ہی چلے جائینگے" جواب ملا "مگر جاؤ گے ضرور!"

مایوس ہو کر ننّے سیدھے اُنہی کرمفرما کے پاس - جن کی شفقتوں کے سہارے آج زندگی کے بقیہ دن گزار رہے ہیں - یہ کرمفرما حضرت گرامی سردار بہادر نصرت جنگ کرنل سیّد عبد العزیز بادشاہ

مرحوم۔ اے ڈی سی وائسرائے آف انڈیا۔ و میر بخشی افواج بھوپال کے صاحب زادے عالی قدر لفٹننٹ سید ابراہیم پاشا تھے۔ جو برٹش انڈیا کے علمی طبقوں کی طرح ہمیں اپنے دل میں جگہ دے چکے ہیں۔ یہی اس لکھنؤ جانے والی ٹیم کے سرکردہ رکن تھے۔ فرمانے لگے۔

"کہئے مولانا! لے آئے روپیہ؟"

ہم نے عرض کیا کہ روپیہ کیسا جان ہی سلامت لے آئے۔ اس پر پاشائے ممدوح نے اپنی دیرینہ شفقت سے کام لیتے ہوئے جیب سے پچاس روپیہ کا ایک نوٹ ہمیں دے کر فرمایا۔

"جائیے اور جلد انتظام کیجئے"

اب جو گھر آئے تو نئے کی اماں کو بلایا۔ اور کافی طور پر اکڑ کر کہا۔

تیار کرو پراٹھے

تیار کرو انڈے

تیار کرو حلوہ

تیار کرو کباب

تیار کرو مرغ

تیار کرو مچھلی

رکھدو مولی

باندھو بستر

Taj Tahir Foundation

نکالو ہاکی شوز

باندھو ہاکی سوٹ، اور بکسوا اور ٹائی!

قریب تھا کہ منّے کی اماں ہمارے ان زوردار احکام پر بھڑک اُٹھتیں۔ اور پھر کوئی بے طرح غزل سُنا دیتیں۔ کہ ہم نے فوراً پاشا صاحب کا نوٹ نکال کر بے وجہ دیکھنا شروع کیا۔ تو منّے کی اماں کی نظر اُس پر پڑ گئی۔ بس اب تو وہ ہماری ہی ہو گئیں! پہلے مسکرائیں پھر فرمایا۔ اور بڑے پیار سے فرمایا۔ "دیکھیں یہ کیا ہے؟" یہ کہا اور ہمارے ہاتھ کی طرف ہاتھ بڑھا کر فرمایا۔ "ہو تو بڑے وہ!" اس ترکیب کا مطلب صاف یہ تھا۔ کہ اب میں نوٹ کی وجہ سے تم سے بہت خوش ہوں۔ لاؤ اس میں سے کچھ منّے کے لئے بھی دیتے جاؤ۔ مگر خدا کا شکر کہ ابھی معاملہ اس حد تک پہنچا تھا۔ کہ پاشا صاحب سے دروازہ پر سے کہا۔

"اماں آنے بھی ہو یا نہیں؟"

بس نصیب دوستاں! ہم مع نوٹ کے باہر۔ اور بچاری منّے کی والدہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

شام کو "دہلی ایکسپریس" سے روانگی تھی۔ اسٹیشن پر ہم کو رخصت کرنے معزز و معتمد احباب جمع تھے۔ پاشا صاحب

کو ہار پہنائے گئے ۔ گو اُس وقت ہم پاشا صاحب کے بالکل ہی پاس کھڑے تھے ۔ لیکن ہار پہنانے والوں کی نظر اتفاقاً چوک گئی اور ہم بغیر ہار کے ریل میں بیٹھ گئے ۔ اور جہاں تک یاد ہے تھرڈ کلاس میں نہیں بیٹھے تھے ۔ جب ریل روانہ ہوئی تو احباب نے تالیاں بجائیں اور رومال ہلائے ۔ تو ہم سمجھے کہ سوار ہونے میں ہم سے کوئی غلطی ہوگئی ۔ اس لئے احباب مذاق اُڑا رہے ہیں ۔ مگر پاشا صاحب نے فرمایا کہ اب بجائے "خدا حافظ" "خدا کی امان" اور "فی امان اللہ" کہنے کے مسلمان رخصت کرتے وقت ایسی ہی حرکتیں کرتے ہیں ۔ تب معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب تعلیم یافتہ ہیں !

چونکہ سفر میں ہم مزاحیوں کا معاملہ بھی طے کر دیتے ہیں ۔ اس لئے فرنگی جل پانس ہمیں "کالا آدمی" نہیں کہتے اور خاصا کرسٹان سمجھ کر ٹکٹ کا سوال بھی نہیں کرتے ۔ اور ریل میں کرسٹان بن جانے سے ایک یہ فائدہ بھی ہے کہ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لے کر اُس ڈبے میں بیٹھ جاتے ہیں ۔ جو فرنگی رعایا پروری اور مساوات داڑھی کی رو سے صرف ۔ "فار یورپین اینڈ اینگلو انڈین" خالی پڑا رہتا ہے ! مگر اس میں اپنے ہندوستان کا کوئی کالا آدمی نہیں بیٹھ سکتا چاہے وہ گاندھی جی ہی کیوں نہ ہوں ۔ اور اسی لئے ایسے موقع پر ہم اپنا نام بھی "جی آئی پی" "مارشل لاء" وغیرہ بتلاتے ہیں ۔ کیونکہ آج کل کے تمام انگریزی یافتہ مسلمان

ایسے ہی نام رکھتے ہیں!

ناگاہ ایک اسٹیشن پر ریل گاڑی کھڑی ہوگئی۔ ابھی "گاڑی تین منٹ ٹھیرے گی" کی پہلی صدا سنی تھی۔ کہ آگئے دس بارہ ننگ دھڑنگ سادھو۔ اور دروازہ پکڑ کر کہنے لگے۔

"مہاراج بھوک کے مارے ہیں۔ گرم کپڑا نہیں۔ ٹکٹ کے دام نہیں۔ کانپور تک جانا ہے۔ اپنے ڈبے میں بیٹھ جانے دو۔ . . . . . "

ابھی ان بیکس ہندوستانیوں کی استدعا پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ آگئے فرنگی گارڈ صاحب اور لال جھنڈی کا ڈنڈا رسید کر کے ان لوگوں سے فرمایا۔ "بھاگو ڈیم ٹین کا بار" (سٹیشن سے باہر) گمراہ ری ہندوستانیوں کی بے کسی۔ کہ ڈنڈا کھا کر بھی یہ ہندو ساد ھو گارڈ صاحب کے قدموں پر گرنے لگے۔ کہ آہی تو پہنچے ہندوستانی فسٹل کے ریلوے پولیس مین صاحب۔ اور ڈنڈا تان کر ان تمام ہندو سادھوؤں کو ہانکنا شروع کر دیا۔ اور اس پر بھی تمہاری . . . . اور۔ تمہاری . . . . بھلا تمہاری . . . . اور لے تمہاری . . . . بھی سنتے جاتے تھے۔ گویا یہ ہندی فسٹل پولیس والے اپنے محتاج ہم قوم اور ہم وطن گداگروں کو اس شدت سے کیا ہانک رہے تھے۔ خود کو دکٹیٹر بنا کر اس کا مستحق بنا رہے تھے! لیکن اس سے ہوتا ہی کیا تھا؟

جس اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری ہندوستانی افلاس کے ماروں کا یہی ہجوم پایا۔ اور کوئی اسٹیشن نہ تھا جہاں ریلوے ملازمین کی آوازوں کے ساتھ ایک آواز۔ "بھلا ہو مہاراج" کی نہ آئی ہو ؛

ایک صبح ہوئی تو ہندو بھائیوں نے اٹھتے ہی "رام رام" کہا۔ گاڑی ٹھہری تو لوٹے ہاتھ میں لیکر نل پر گئے اور اسٹیشن پر لگے ہوئے پیپل کے درخت پر پانی ڈالا۔ مذہبی بھجن پڑھے اور اس طرح صبح کی عبادت سے فارغ ہوکر ڈبے میں آ بیٹھے + لیکن ہم اٹھے تو صرف ایک مرتبہ تو کہا "لاالٰہ الا اللہ" اور پھر فوراً ایک سیگرٹ پیا۔ بکس سے تولیا۔ صابون۔ استرا اور پاؤڈر لے کر ریل کے غسل خانے میں گئے۔ داڑھی مونچھوں کا حساب صاف کیا۔ نہائے اور نیا سوٹ بدل کر آ گئے۔ اور دوستوں سے انگریزی زبان میں گفتگو شروع کر دی۔ گویا ہم نے صبح صرف لفظ لاالٰہ ایک مرتبہ پڑھ کر خدا کے تمام عبادتی احکام کی تعمیل کر دی! مگر مجبور تھے۔ کیونکہ فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے مسلمان مسافر صبح اٹھ کر صرف اتنا ہی کام کرتے ہیں۔ یہ تو فقط دیوبندی ہوتے ہیں۔ کہ سفر میں بھی قرآن مکرم کی تلاوت اور نماز سے نہیں چوکتے!

ایک اسٹیشن پر دیکھا۔ کہ چند مسلمان پولیس والے ایک محتاج ہندوستانی مسلمان کے ہاتھ پاؤں زنجیر سے باندھے کھڑے ہیں۔ اور زنجیر اس درجہ سخت باندھی ہے کہ وہ حرکت بھی نہیں کر سکتا +

اگر اُسے اپنے منہ تک ہاتھ لے جانے کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ بجائے ہاتھ کے اپنے مُنہ کو کسی اور چیز سے جانور کی طرح رگڑ لیتا ہے! پھر اس شدید جکڑ بند پر اس کے سر پر اس کا وزنی بستر بھی رکھوایا گیا تھا۔ جو اس سے کسی طرح نہیں سنبھلتا تھا۔ مگر سنبھالے ہوئے تھا۔ اور چہرہ سے فاقہ کی علامتیں ظاہر تھیں + نہ رہا گیا۔ جا کر پولیس کے ان ہندوستانی بھائیوں سے کہا۔ کہ آپ نے اس بیکس انسان کو انسان ہو کر کیوں اس درجہ شدت سے جکڑا ہے؟ تو جواب ملا؛ اُس نے ایک مسافر کا لوٹا چرا لیا ہے + ہم نے "چور" کے سوال کیا۔ کہ کیوں بھئی تم نے لوٹا کیوں چرایا؟ اس پر ملزم رو کر کہنے لگا۔

"حضور بے روزگاری کا دورہ ہے۔ اچھے اچھے پڑھے لکھے مارے پھرتے ہیں۔ نہ سفارش کام کرتی ہے اور نہ مزدوری ملتی ہے۔ بیوی بچوں کا ساتھ ہے۔ بھوکا تھا اس لئے یہ حرکت کی!"

اس جواب پر ہم نے ان خالص ہندوستانی پولیس والوں سے کہا کیوں بھائیو! اگر صرف ایک لوٹا چرانے پر آپ اس مظلوم کے صرف ایک ہی زنجیر ڈال دیتے۔ تو کیا یہ افغانستان بھاگ جاتا؟ اس پر ملزم نے پھر رو کر کہا۔

"ارے حضور آپ ۔۔۔ تو ابھی زنجیر ہی دیکھی ہے آپ

میرے کپڑے اُٹھا کر دیکھئے۔ رات بھر حوالات میں مجھے جانور کی طرح پیٹا ہے۔ اور یہ صرف اس لئے کہ میں اُن کا قومی اور ملکی بھائی ہوں!"

یہ سُن کر ہم نے کہا۔ "اچھا ہی ہُوا کہ ہندوستانیوں کو سوراج نہ ملا!"

کانپور کا اسٹیشن آیا تو یہاں سے فروٹ۔ سیگرٹ اور پایونیر اخبار خریدا۔ اور گو اردو اخبار بھی فروخت ہو رہے تھے۔ مگر ان پر اس لئے نظر تک نہ ڈالی۔ کہ وہ تھے ہمارے ملکی اور قومی اخبار اور اپنی ماوری زبان کے اخباروں کو فرسٹ اور سیکنڈ کلاس میں بیٹھ کر پڑھنا صریح "اِن سلٹ" ہے! اور گمپارٹمنٹ کی توہین! اور ہیٹ کی ہتک!!

لکھنؤ پہنچے تو احباب کی جماعت نے شاندار استقبال کیا+ چیف کمشنر لکھنؤ دورہ پر گئے ہوئے تھے۔ اس لئے ہمارے استقبال میں شریک نہ ہو سکے+

شام کو کھیل تھا۔ اس لئے دن بھر تیاری میں مصروف رہے کبھی دعا کی۔ کبھی وظیفہ پڑھا۔ اور ضبط نہ ہوا۔ تو لکھنؤ کے "مشہور پیر جی عامل" کے پاس پہنچے جو صرف اڑھائی روپیہ کے تعویذ سے معشوق اور وائسرائے ہند تک کو تابع فرمان بنا کر چھوڑتے ہیں+ تعویذ لیا تو اطمینان ہُوا کہ اب فتح ہماری ہے! فیلڈ پر پہنچے تو

دیکھا کہ آل انڈیا کے چیدہ کھلاڑی جمع ہیں۔ اور تماشائیوں کی بھی کمی نہیں +

ہندوستانی ٹورنامنٹ اور انگریزوں کی ٹورنامنٹ میں یہ فرق ہوتا ہے۔ کہ انگریز تماشائیوں کے لئے کافی کرسیوں اور گیلریوں کا انتظام کرتے ہیں۔ اور تماشائی پورے سکون سے بیٹھے رہتے ہیں + جب کوئی کھلاڑی گیند لیکر بھاگتا ہے تو انگریز مرد اور عورتیں صرف تالیاں بجا دیتے ہیں + لیکن ہندوستانی ٹورنامنٹ میں یہ ہوتا ہے کہ بعض اہل محلہ سے کرسیاں عارضی طور پر لے لی جاتی ہیں اور وہ بھی صرف چند مخصوص احباب کے لئے۔ باقی عام تماشائی فیلڈ کے چاروں طرف محاصرہ کر کے ایک کے اوپر ایک کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کوئی ٹانگوں میں سے سر نکال کر دیکھتا ہے۔ کوئی دھکا دیتا ہے۔ کوئی کاندھے کو چیرتا ہے۔ کوئی کمر پر زور دے کر دوزانو کھڑا رہتا ہے اور بعض پیچھے پاس کے درختوں پر چڑھ کر مزے سے محو نظارہ ہوتے ہیں! اور جب کوئی کھلاڑی گیند نکال لے جاتا ہے تو داد یوں دی جاتی ہے۔

"واہ بھائی! واہ رے وا! ہاں لینا! لگے! مارے۔ ڈٹے رہو۔ چل چل۔ بڑھ۔ توڑ دے ٹانگ! مار دے اسٹک! مار مار! ہاں یہ یہ! ایک اور! دے

بڑھ کر! نوچ لے کُرتا! پھاڑ دے سر! چھین لے اچکن!"

وغیرہ -

لیکن یہاں تھا معاملہ لکھنؤ کا - اس لئے چاروں طرف سے -

"ہاں حضرت! بڑھنا حضرت! لینا حضرت! واللہ

حضرت! باللہ حضرت!"

کے نعرے بلند ہو رہے تھے - الغرض اِن حالات کے ساتھ ہماری ٹیم کا پہلا میچ "بنگال ینگ مین بی" سے شروع ہُوا - اُس وقت دیکھنا کوئی ہماری "سلطانیہ پائنیر ٹیم" کے جوانوں کو - جن میں کا ہر ایک ماشاء اللہ کچھ اس درجہ مستعد اور ذی حوصلہ تھا کہ فیلڈ والوں نے دیکھتے ہی فیصلہ کر دیا کہ یہی جیت جائینگے + مگر ابھی کھیل شروع ہُوا ہی تھا - کہ بنگال ینگ مین کے کھلاڑی کا ایک ہاتھ ہماری پنڈلی پر کچھ اس خوبصورتی سے پڑا - کہ ہم نہایت انکسار سے شہنشاہ تیمور بن کر فیلڈ کے کنارہ پر جا بیٹھے! ہماری اس حالت کو دیکھ کر ہماری ٹیم والوں نے اس جرأت اور تیزی سے کھیل شروع کیا - کہ مسلسل سات "وکٹ" بنگ مین بی کو گھر جانے پر مجبور کر دیا!

دوسرا میچ لکھنؤ - "بنگال ینگ مین اے" سے شروع ہُوا + اس میں چند سفید رنگ کے بزرگ شریک تھے - خصوصاً مسٹر ہابل جو کبھی ہارنا ہی نہیں جانتے تھے + مگر سلطانیہ پائنیر کے مسٹر سعید

بھی ایک ہی کھلاڑی ہیں۔ چونکہ ینگ بین اے نے ہمیں چار گول سے شرطیہ شکست دینے کا دعوے کیا تھا۔ اِس لئے بھائی سعید کو آگیا تاؤ۔ اور اُنہوں نے باقاعدہ طور پر ایک ہاتھ جو رسید کیا تو حضرت سلامت فیلڈ پر لیٹے ہوئے نظر آنے لگے! ادھر مسٹر نعمت اللہ خاں جمعدار نے بڑی سرعت سے گول کر دیا۔ تو ینگ بین اے کے تمام بھائی بند حیران ہو کر ایک سو کی شکست سے اپنے وطن واپس ہو گئے!

تیسرے میچ میں مسٹر منظور حسین کی برکت سے کامیابی حاصل ہوئی۔ کیونکہ انہوں نے کارنر سے ایسا بے نظیر گول نکالا۔ کہ سبحان اللہ! آج آخری میچ تھا مگر اُس ٹیم کے ارکان چونکہ مسلمان تھے۔ اور ہم بھی مسلمانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اِس لئے کھیل میں ہنگامہ آرائی کے مقابل محبت واخوۃ کے مناظر نظر آرہے تھے۔ پھر بھی کھیل نہایت شدت سے ہو رہا تھا۔ خصوصاً پاشا صاحب اور مسٹر عبدالمجید صاحب کا کھیل نمونہ تھا + یہ میچ "رودرس" کلب سے تھا۔ جس میں نہایت نامور کھلاڑی شریک تھے۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ پورا وقت گذر گیا۔ لیکن دونوں ٹیمیں برابر رہیں۔ اور آخر میں جو وقت ملا اس میں جب رودرس ٹیم۔ گیند ہمارے گول کے قریب لائی۔ تو سلطانیہ پانیئر والوں اور رودرس والوں کو دھوکا ہو گیا۔ کہ وسل ہو گئی تو دونوں ٹیموں کے کھلاڑی رُک گئے۔ لیکن رودرس

کے ایک کھلاڑی نے بڑھ کر گیند کو گول سے نکال دیا - اور لوگوں نے شور مچا دیا کہ ہم پارسال ضرور کپ لے جائینگے انشاء اللہ !

کھیل کے بعد سلطانیہ پائنیر والوں کو ہار پہنائے گئے - اور انعام میں شیلڈ دی گئی + پاشا صاحب قبلہ کو فرسٹ میڈل ملا - ہمارے انعام کا معاملہ ابھی عدالت کے زیر غور ہے !

بہرحال سلطانیہ پائنیر کی اس بے مثل شہرت - مقبولیت اور بے نظیر کھیل پر ٹیم کے سرپرست عالی جناب - کرنل انعام اللہ خاں صاحب بہادر کمانڈر آفیسر سلطانیہ پائنیر کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں - جن کے حسن خلوص اور سرپرستی سے یہ ٹیم اس درجہ ترقی پر پہنچی + اسی طرح ہم رام لال ٹورنامنٹ کے بانی حضرت ڈاکٹر چکرورتی کے حسن اخلاق کے شکر گزار ہیں +

آئندہ کسی اشاعت میں ہم انشاء اللہ سلطانیہ پائنیر کے آل انڈیا آغا خاں ٹورنامنٹ کی شرکت کے حالات پیش کرینگے - بشرطیکہ ہماری ٹانگ پر پھر کوئی اسٹک نہ پڑے !

Taj Tabri Foundation

مشاعرہ کا علی گڑھ

وُہ جو اخباروں میں اعلان ہُوا تھا کہ "مشاعرہ میں علی گڑھ ہونے والا ہے۔ سو وہ ۲۹، و ۳۰، نومبر کی راتوں میں علی گڑھ کالج کی "المعروف بہ یونی ین" میں بپا ہو گیا + یہ اعلان چونکہ ادبیات اُردو کے دیرینہ محسن حضرت قبلہ مارہروی احسن صاحب مدظلہ کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اِس لئے جب ہم مشاعرہ میں داخل ہوئے۔ تو ممدوح صدارت کی کرسی سے کرسی ملا کر بیٹھے نظر آئے + اِس سے ایک فائدہ یہ بھی تھا۔ کہ دُور بیٹھنے والے کبھی کبھی آپ ہی کو صدر صاحب سمجھ لیتے تھے۔ ایک صاحب نے محض اتنی سی بات پر صدارت کی کُرسی سے اپنی کرسی ملا لی تھی۔ کہ شعرا سے غزلیں لے کر ایک کے اوپر ایک کر کے رکھتے جائیں + بعد میں معلوم ہُوا کہ آپ کو اس کا حق تھا +

اصولاً ہر شخص کو اُمید تھی کہ اس عظیم الشان مشاعرہ کے صدر بھی کوئی عظیم الشان سلطان الشعراء ہی ہونگے۔ اور ہُوا بھی یہ کہ مولانا حسرت موہانی کو صدارت دی گئی۔ لیکن خدا جانے وہ کس "مشق سخن" اور "چکی کی مشقت" کے باعث تشریف نہ لا سکے۔ تو

صدارت کا معاملہ محترم پرنسپل صاحب کو پیش کیا گیا - اور "معتبر ذریعہ" سے اطلاع ملی - کہ عالی جناب پرنسپل صاحب نے صدارت سے صاف انکار کر دیا - لیکن جب ممدوح کو ہر طرح مجبور ہی کر دیا - تو آپ نے بھی جھنجھلا کر افتتاحی تقریر انگریزی زبان میں کر ڈالی +

مشہور اور قابل ذکر لوگوں میں سب سے زیادہ ہم خاکسار ملا رموزی ابوالاثر جالندھری حفیظ صاحب ایڈیٹر مخزن لاہور مراد آبادی مولوی بدر جلالی بی اے ایڈیٹر اخبار مدینہ بجنور - مراد آبادی حضرت جگر - اکبر آبادی حضرت سیماب - ثم الاکبر آبادی حضرت ساغر - حضرت دہلوی ساحر - حضرت مرزا پوری صفدر صاحب - حضرت ہاپوڑی اطہر صاحب - حضرت بی اے ایل ایل بی شاد صاحب - کالج اور یونیورسٹی کی سمت سے حضرت رشید احمد صدیقی ایم اے ایڈیٹر سہیل - حضرت پروفیسر حاذق - حضرت جلیل قدوائی بی اے حضرت مسعود ذوقی بی اے وغیرہ خاص تھے + بڑی خوشی کی بات یہ تھی - کہ اُن میں سے ہر شخص نے حسب توفیق گا کر غزل پڑھنے کی کوشش کی - صرف قبلہ احسن صاحب نے اس حرکت سے اظہار بے بسی فرمایا +

کالج کے آئین و ضوابط میں آیا ہے - کہ جلسہ کے شروع میں

قرآنِ محترم کی تلاوت ہو۔ لہٰذا عالی قدر صدر نے تلاوت قرآن کا اعلان فرمایا + نتیجہ یہ ہوا کہ چند مونچھیں منڈے طلباء کو بھی ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا پڑا + قاری صاحب کا شاید آموختہ کچا تھا۔ اِس لئے وہ جو ایک جگہ بھولے۔ تو قبلہ احسن صاحب نے بھی لقمہ دینے میں کمی نہ کی + پہلے کالج کے طلباء نے غزلیں پڑھیں جو بمقدار علم اچھی تھیں۔ ایک طالب علم جواب تک کالج بھر میں صرف مولانا محمد علی شوکت علی اور ظفر علی خاں ہی کو "مایۂ ناز" سمجھے ہوئے ہیں۔ ایک غلط شعر پڑھنے پر روک دیئے گئے۔ جس میں "غلام السیدین" کا وزن غلط تھا +

کالج اور یونیورسٹی کے لوگوں میں حضرت مسعود ووفی۔ حضرت جلیل قدوائی۔ حضرت حاذق صاحب پروفیسر اور حضرت قبلہ احسن صاحب کا کلام بے حد پسند کیا گیا + اس کے بعد مہمان شعراء کی باری آئی۔ اور سب سے پہلے وہی "اودھ کے اہل زبان" لوگوں کی یادگار کے طور پر حضرت زرؔہ کانپوری کام آئے جنہوں نے پہلے اپنے پاس ایک مُرادآبادی اُگالدان اور ایک گلاس پانی رکھوالیا۔ اور بجائے کرسی زمیں دوز ہو کر بیٹھ گئے اور معاً اچھل پڑے یعنی مطلع ارشاد فرمایا اور تمام اشعار میں کودتے رہے + ایک جگہ جیب سے تمغہ بھی نکال کر ڈال دیا۔

جس کے یہ معنی تھے کہ مجھے سمجھا کیا ہے؟ مگر لوگوں کی بے مروّتی دیکھئے کہ کسی نے اِس تمغہ پر نظر بھی نہ ڈالی - اور ممدوح کمبل سنبھال کر اپنی جگہ پر جا بیٹھے +

گانے والے شعراء میں وہی جو مقبول عالم جنتری کی طرح مشہور ہیں - نہایت آن بان سے اسٹیج پر تشریف لائے - نظم ارشاد فرماتے وقت کہیں کہیں اُکڑ کر خاص دوست کو نام لے کر پکارتے اور ڈانٹ ڈانٹ کر پڑھنے کی خدائی فوجداری کی مزید توفیق بھی صرف آپ ہی کو حاصل تھی + پھر طرفہ یہ کہ آپ "موسمی حوائج ضروری" سے بھی مرتب ہو کر تشریف لائے تھے - چنانچہ کرسی پر جو آپ آئے تو نصف سگار پیتے اور بغیر پیئے گرم دستانے اِس طرح ہاتھ میں لئے ہوئے تھے - گویا کہیں کے بڑے ہی "ہز میجسٹی" ہیں جو اپنے اسٹیچو کے لئے تصویر کھچوانے جا رہے ہیں + پھر کمال یہ کر دکھلایا - کہ نظم سے پہلے دو چار رٹے ہوئے الفاظ کی معرکتہ الآرا تقریر بھی کی +

جناب مذکورہ کے بعد حضرت جالندھری حفیظ صاحب کا نام نامگاہ جو پکارا گیا - تو حاضرین میں ہندو مسلم فساد کے رنگ کا فتور پیدا ہوا - اور جس وقت حفیظ صاحب نے اپنا باسی کلام

تازہ لے میں ارشاد فرمایا۔ تو تحسین و آفرین کے نعروں میں اصل کلام
سننا محال تھا۔ ہر شخص اپنی جگہ پر بے چین تھا۔ مگر وہ جو کہا ہے
کہ۔

"خدا بخشے انگشت یکساں نہ کرد"

تو کالج کے ایک نوجوان پروفیسر بھی تھے۔ جو ٹس سے مس تک
نہ ہوئے۔ البتہ کہیں کہیں ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ جاتے تھے
گویا ان کے سامنے ان کے اہل و عیال کھیل رہے تھے۔ اور
وہ مارے بزرگی کے ان کی طرف سے اعراض فرما رہے تھے +

گانے والے شعراء میں حضرت سیماب اکبر آبادی۔ جگر
مراد آبادی۔ حفیظ جالندھری کا کلام نہایت درجہ
پسند اور مقبول ہوا۔ خدا اپنے بڑے مولوی صاحب
کو ان حرکات سے محفوظ رکھے + دوسری رات کو حالی مرتبہ صدر
نے بے حد تپاک اور مہربانی سے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور
مہمانوں کی طرف سے بغیر مشورہ کئے حضرت بدر جلالی ایڈیٹر
مدینہ نے جہاد کے لہجہ میں کالج کا شکریہ ادا کر کے معاملہ طے
کر دیا + مشاعرہ کو کامیاب بنانے کے لئے حضرت گرامی قدر قبلہ
مولوی احسن صاحب مارہروی۔ محترم و مکرم پرنسپل صاحب کالج اور
تمام چائے پلانے والے حضرات حامیان اردو کے شکریہ کے مستحق ہیں +

Taj Tabir Foundation

نکات و لطائف

تمام دنیا کی شہری آبادی کا امن اسی وقت برہم ہوتا ہے جب شہر کا افسر اعلےٰ ظالم ہو یا اس شہر میں مارشل لا کا نفاذ ہو جائے یا کوئی ہنگامہ ہو۔ یا کوئی غنیم حملہ آور ہو۔ لیکن دنیا یہ سن کر کہا کہیگی کہ برّاعظم ہندوستان کے دارالحکومت عرف دہلی کا امن برہم ہو رہا ہے گائے بیلوں سے؟ چنانچہ اس سے قبل اسی دہلی میں سانڈوں کے ایک شورش پسند گروہ نے بازار پارچہ فروشی میں اطلس۔ کمخواب اور ریشم کے ہزاروں روپے کے کپڑے تباہ کر ڈالے۔ مگر پولیس ان سانڈ نشینوں سے ایک کو بھی اب تک گرفتار نہ کر سکی تھی۔ کہ پھر ۲۴۔ جولائی کو بازار بلیماران میں ان سانڈ لوگوں کا معرکہ بپا ہو گیا۔ جس کی وجہ سے نصف گھنٹہ تک راستہ بالکل رکا رہا۔ اور الجمعیتہ کے نامہ نگار کے الفاظ میں۔ خطرہ کی وجہ سے لوگ باگ دونوں طرف رُکے رہے +

بارے خدا خدا کر کے جب ایک سانڈ کو شکست فاش ہوئی اور وہ دفتر اخبار الامان کی طرف پسپا ہوا۔ تب کہیں دفتر اخبار الجمعیتہ کی طرف سے پناہ گزین چلنے پھرنے کے قابل ہو سکے +

واقعی ہم نے قیام دہلی کے زمانہ میں بچشم خود دیکھا ہے۔ کہ جب ران ساندھ حضرات کا کوئی عظیم الشان دنگل وسط بازار میں شروع ہو جاتا تھا۔ تو باشندگان دہلی ایک کے اوپر ایک ہو کر دکانوں میں پناہ تو لیتے تھے۔ مگر مارے خوف کے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکتے تھے۔ اور ان لوگوں کے بیچ بچاؤ یا صلح و مصالحت کی تمام ذمہ واری پولیس پر چھوڑ دی جاتی تھی۔ لیکن رہ روان دہلی کی اس وحشت کو ملحوظ رکھتے ہوئے پولیس سے کسی قسم کی شکایت اس لئے بیکار معلوم ہوتی ہے۔ کہ آخر کو پولیس بھی دہلی ہی کی ہے۔ اس لئے دعا ہے کہ خدا ان مردم خوار سانڈوں سے ساکنان دہلی کو جلد نجات دے۔ مگر کیوں صاحب اگر ان سانڈوں کا کوئی معرکہ شہر لکھنؤ میں واقع ہو جائے تو باشندگان لکھنؤ کا بارے خوف کے کیا حال ہو؟

پھر بھی ہم کوتوال صاحب دہلی سے بہ ادب سوال کریں گے کہ آخر جناب والا کی یہ سانڈ پروری اور سانڈ نوازی کب تک؟ آپ دیکھ رہے ہیں۔ کہ ان سانڈ لوگوں کی شورش سے ساکنان دہلی کے کلیجے منہ کو آ رہے ہیں۔ پس ضرورت ہے کہ آپ ان سانڈ لوگوں کی تنبیہ کے لئے ایک ہفتہ کا اس طرح نوٹس دے دیجئے۔ کہ

"ہر گاہ تمہاری شورش پسندی دہلی کی غیر مصافی آبادی کے حق میں نہایت مضرت رساں ہے۔ لہذا تم کو ذریعہ ہذا مطلع کیا جاتا ہے کہ تم ایک ہفتہ کے اندر شہر دہلی کو خالی کردو۔ ورنہ پولیس چالیس گز کے فاصلہ سے تمہارے اوپر ہوائی فیر کرنے پر مجبور ہو جائیگی۔ پھر ہم نہیں جانتے کہ گولی تمہارے سر یا سینہ میں لگ جائے"

امید ہے کہ پولیس کے اس نوٹس پر یہ سانڈ حضرات باز آ جائینگے۔ ورنہ پھر اپنے سر سائیکل اوڈوائر صاحب سے اس باب میں مشورہ لینا پڑیگا + اللہ پاک ان سانڈ و رندوں سے اپنے دہلی کے تمام بندوں کو محفوظ رکھے + افسوس تو یہ ہے کہ دہلوی خلافت کمیٹی کے رضا کار اور سیوا سمتی کے والنٹیر بھی اس خطرہ سے لوگوں کو بچانے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے +

دہلی کے اس سانڈ شاہی عہد میں یہ خطرہ نہایت گراں ہے کہ اگر کسی دن یہ سانڈ حضرات کسی دہلوی اخبار اور مطبع کے پیچھے بیچ زور آزما ہو گئے۔ تو کیا یہ ممکن نہیں کہ اخبار اور مطبع کے ارکان مارے خوف کے دونوں طرف مڑ کے رہیں اور اس دن کا اخبار ہی شائع نہ ہو سکے؟ کیونکہ اب تو دہلوی اخبارات کو

یہ عذر سانڈیانہ ہاتھ آگیا ہے اور وہ دوسرے دن اعتذار کی جلی سرخی کے ساتھ یہ لکھ سکتے ہیں۔ کہ چونکہ دوسانڈ عین دفتر اخبار کے سامنے بری طرح گتھ گئے تھے۔ اس لئے کل کا اخبار شائع نہ ہو سکا۔ آئندہ اشاعت میں اس کی تلافی کر دی جائیگی۔ ناظرین اور ایجنٹ حضرات معاف فرمائیں ٭

Taj Tahir Foundation

کالا آدمی

جنوبی افریقہ میں۔ گول میز کانفرنس کیجئے چاہے کوہ ہمالیہ پر بیٹھ کر تالیاں بجایئے۔ یہ جو ہندوستان کے تیس بتیس کروڑ انسان "کالا آدمی" ہو چکے۔ سو اب سفید نہیں ہو سکتے + یقین نہ ہو تو شریک ہو جایئے۔ وائسرائے کے اِستقبالی ہجوم میں جمع ہو جایئے کسی بازار میں۔ اور مجمع کیجے کسی ریلوے پلیٹ فارم پر۔ بس ایک انگریز صاحب آئینگے اور "اے کالا آدمی" کہہ کر آپ کو ہٹا دینگے۔ علیحدہ کر دینگے۔ اور کبھی آپ کے اوپر سے گھوڑا دوڑا کر منتشر کر دینگے۔ مگر یہ کبھی نہ کرینگے کہ "کالا آدمی" سمجھ کر ریل کا کرایہ۔ لفافوں کی قیمت یا میونسپل ٹیکس آپ سے کم کر لیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آخر انگریزوں نے ہندوستانیوں کا تخلص "کالا آدمی" ہی کیوں رکھا؟ اِس کا جواب قادیان کے مسیح موعود نے یہ دیا ہے کہ جبکہ ہم ہندوستانی پانی پت کے میدان میں انگریز بھائیوں کے مقابلہ سے بھاگ چکے۔ تو اب انگریز ہو گئے "اولی الامر منکم" لہذا اب ان پر کوئی اعتراض۔ سوال تنقید۔ غرض سب کچھ حرام ہے + لیکن ان تمام وجوہ کو ہم نے رد کر دیا۔ اور فکر باقی ہی رہی۔ کہ آخر

کالا آدمی کسے کہا جاتا ہے - تو ایک علی گڑھی فرمانے لگے :-

کالا آدمی وہ

جو کسی عہدہ کا چارج لیتے ہی اپنے ہم قوم ماتحتوں کا گلا کاٹے ٭
جو ہندوستانی ہو کر بھی کتا اور رحم ساتھ نہ رکھے ٭
جو اردو جانتے ہوئے بھی خواہ نخواہ انگریزی بولے اور لکھے ٭
جو ایف اے پاس ہو کر بھی رشوت کے لئے پولیس میں نوکری کرے ٭
جو ایل ایل بی ہو کر مسلمانوں کو مقدمہ بازی میں پھنسائے ٭
جو علم دین کی تکمیل کئے بغیر اخبارات میں قرآنی آیات سے بحث کرے ٭
جو نظام حیدر آباد کی مخبری کرے ٭
جو اپنے گھر میں نا اتفاقی کی آگ لگا کر ابن سعود کی اصلاح کو دوڑے ٭
جو لیڈر بھی ہو اور کونسل کا ممبر بھی ٭
جو نفس کش صوفی بھی ہو اور موٹا تازہ بھی ٭
جو قومی جلسوں میں بیٹھ کر رونا بھی ہو اور سی آئی ڈی بھی ٭
جو زنانہ رسالہ کا ایڈیٹر بھی ہو اور بد اطوار بھی ٭
جو مولانا بھی ہو اور بے نماز بھی ٭

غرض کالا آدمی کے اس قدر معنی بیان کرنے پر بھی - جب

Taj Tahir Foundation

ہمیں یقین نہ آیا - تو خدا نے ایک اور غیبی ترکیب سے ہمیں "کمالا آدمی" دکھا دیا - جو کسی قدر قصہ طلب ہے +

وہ جو کہا ہے - کہ "پاؤں میرے کو لنگر اپن نہیں ہے اور ملک خدا کا تنگ نہیں ہے" سو اس خالص فارسی مثل کے موافق ہم "تلاش معاش" میں چلے جا رہے تھے + ناگاہ ایک اسٹیشن پر ہماری ریل کھڑی ہو گئی - کیا دیکھتے ہیں کہ چلے آ رہے ہیں + حال یہ کہ تھے تو قوم کے صرف غلام ہندوستانی - لیکن محض انگریزی پڑھ لینے کی وجہ سے دماغ آسمان پر اور مزاج عرش پر تھا + کوٹ اڑھائی سو روپیہ کا سوٹ - سیاہ بوٹ - آنکھوں پر چشمہ اور ہاتھ میں چھڑی مگر آہ کہ خرچ سے تھے تنگ - اس لئے ملازم نے بہتیرا کہا دیا تھرڈ کلاس میں - اور جب گاڑی روانہ ہونے لگی تو لٹک گئے بیچارے تھرڈ کلاس میں - مگر ڈبے میں داخل ہوتے ہی ہم مسافران کوئے تھرڈ کلاس پر گلیڈ سٹونی نظر ڈالی اور بیٹھ گئے - اور ایک کسان کی کمر سے کمر جوڑ کر + البتہ انداز نشست بتا رہا تھا کہ سر آسٹن چیمبر لین وزیر خارجہ برطانیہ جمعیتہ الاقوام میں بیٹھے کسی اہم بین الاقوامی معاہدہ کو مرتب فرما رہے ہیں - جس میں ہم ایشیا والوں کو ہر طرح ذلیل رکھنے اور ذلیل سمجھنے کی دفعات زیر غور ہیں + نہ رہا گیا - تو ان کے ملازم کو علیحدہ بلا کر دریافت کیا کہ آخر یہ حضرت ہیں کون ؟ ملازم

نے ان کا تعارف جن الفاظ میں کرایا - وہ یوں ہے کہ -

"جناب من تسلیم!

یہ حضرت یو-پی کے ایک گاؤں کی پیداوار ہیں - ایف اے تک اس طرح تعلیم پائی کہ قومی چندہ سے آپ کو تعلیمی وظیفہ ملتا رہا + ایف - اے کے بعد ایک بڑے شخص نے آپ کی سفارش کر دی - تو آپ ہو گئے ایک افسر + بس افسری کا ملنا تھا - کہ آپ سے باہر ہو گئے - ہندوستانیوں سے بات کرنا ترک کر دیا - سلام کا جواب ایک انگلی سے دینے لگے - اردو زبان ہمیشہ کھڑی ترچھی یا آڑی بولتے تھے + نماز کے وقت ٹینس یا کرکٹ کھیلتے تھے + نتیجہ یہ ہوا کہ آپ پر قہر الٰہی کا نزول شروع ہوا - اور ایک رشوت کے مقدمہ میں آپ تین سال سے ہر طرف پھر رہے ہیں - اور گو آپ ایف - اے ہیں لیکن کہیں جگہ نہیں ملتی + مجھے صرف ایک مہینہ کے لئے ملازم رکھ لیا ہے - تاکہ پردیس گردی میں آپ کی شان قائم رہے" +

ان حالات کو سن کر ہمیں ان سے گفتگو کرنے کا بیحد شوق پیدا ہوا - مگر ان کی ظاہری اکڑفوں کو تباہ کرنے کی بھی فکر ہوئی + خدا کا کرنا ایسا کہ ایک جگہ ریل میں ہم کسان بھائیوں کی غیر معمولی درآمد برآمد سے آپ تنگ ہو کر ہمارے پاس ہی آ بیٹھے + ادھر ہمارے سفر کرنے کا طریقہ یہ ہے - کہ ہم سیٹ پر ایک لحاف بچھا

لیتے ہیں - پھر اس پر آہستہ آہستہ لیٹنا شروع کر دیتے ہیں - یہاں تک کہ تھوڑی دیر میں اس پوری نشست کے اسی طرح مالک بن جاتے ہیں - جس طرح یہ انگریز بھائی تجارت کے بہانے رفتہ رفتہ ہر ایشیائی ملک کے مختار کل + پھر یہی نہیں کہ صرف سیٹ پر ہی قبضہ کر لیتے ہیں - بلکہ ہر بیٹھنے والے کو بد ترازبی - اے پاس سمجھتے ہیں - اور چہرہ کو اس درجہ غضب ناک بنا لیتے ہیں - کہ اکثر سر میں درد پیدا ہو جاتا ہے - اور آنکھیں پٹے بغیر ہی لال رہا کرتی ہیں + اس سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ مارے خوف کے ایک کے اوپر ایک ہو کر تو بیٹھ جاتے ہیں - لیکن ہمارے پاس بیٹھنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوتی - اور ہم تمام راستہ آرام سے سوتے چلے جاتے ہیں + لیکن اب جو مذکورۂ بالا "ہمارے بالکل ہی پاس آ بیٹھے - تو جی میں تو آیا کہ آپ کو خیر آبادی شاعر کا یہ مصرع سنا دیں کہ ؎

تم اپنا منہ ادھر کر لو ہم اپنا منہ ادھر کر لیں

لیکن محض تہذیب کے خیال سے انہیں مرعوب کرنے کی ترکیب یہ نکالی - کہ اپنا بکس کھولا اور کوئی دس بارہ اخبار انگریزی زبان کے نکال کر الٹے سیدھے پڑھ ڈالے + پھر یہ کیا کہ واٹر پین فونٹین پین نکال کر ذرا ان سے قریب ہو گئے تاکہ یہ ہماری فی السبدیہ انشا پردازی سے ہماری علمی قابلیت کا بھی اندازہ کر لیں + یہ

کر کے ہم نے فوراً عنوان لکھا "گورنمنٹ جابر ہے"۔ گورنمنٹ کو نکال دو۔ "گورنمنٹ کو قید کرو" وغیرہ + بس ان عنوانوں کا پڑھنا تھا کہ بھائی صاحب کے حواس جاتے رہے۔ سانس پھول گیا۔ جسم کے بال کھڑے ہو گئے اور گھبرا کر بولے۔ "جناب کا نام؟" ہم نے کہا۔ خاکسار کا نام۔ ضیاء الملک حضور ملّا رموزی فاضل الہیات۔ ندوی۔ ایم اے علیگ۔ آکسن کینٹب نائٹ۔ آنریبل خان بہادر۔ سر۔ خاں صاحب۔ رائے بہادر۔ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ ہز ہائی نس مہاراجہ اور اعلیحضرت" + فرمایا"۔ یہ نام کے ساتھ اس قدر الفاظ کا کیا مطلب؟" ہم نے کہا۔ "جناب یہ تو تھا صرف ہمارا تخلص" + تو گھبرا کر فرمایا"۔ پھر جناب کا اصل نام؟" ہم نے کہا۔ "قدوۃ السالکین۔ زبدۃ العارفین۔ خلیفۃ المسلمین مسیح موعود۔ حکیم الامۃ۔ رئیس الاحرار۔ مصورِ فطرت۔ ترجمانِ حقیقت۔ خواجہ۔ علامہ۔ مفتی۔ احمد رموزی۔ قادیانی۔ دیوبندی بریلوی۔ نظامی۔ قادری۔ چشتی۔ حنفی۔ نقشبندی۔ محدث علی پوری عفا عنہ اور غفرلہٗ" + فرمایا "اس قسم کے نام کس قوم میں ہوتے ہیں؟" ہم نے کہا۔ "اس قسم کے نام صرف ہندوستانی مسلمان ہی رکھتے ہیں" + فرمایا "وطن"؟ ہم نے کہا۔ "وہی جہاں دربست اس لئے دشمن ہو گئے ہیں۔ کہ ہم مشہور و معروف اہل قلم کیوں ہیں؟" فرمایا۔ "مشغلہ"؟ آہ کہ ان کے اس سوال پر ہماری

آنکھوں سے ساون بھادوں کا موسم شروع ہو گیا۔ اور ہم نے کہا
کہ حضور مشغلہ یہی کہ تلاش معاش میں نکلے ہیں + یہ سن کر آپ
بھی آب دیدہ ہو گئے اور فرمایا۔ "مولانا میں بھی اسی مصیبت
میں گرفتار ہوں" + ہم نے کہا۔ کہ آپ انگریزی زبان نہیں جانتے
جو نوکری نہیں ملتی؟ فرمایا۔ "مولانا آج کل نوکری ملتی ہے۔
سفارش سے۔ نہ انگریزی سے۔ اور سفارش ملتی ہے خلامی۔
خدمتگاری۔ مخبری۔ جاسوسی۔ اور رشوت سے" + تو ہم نے کہا۔
"پھر ٹھیر جائیے آپ بھی آج فیض آباد کے تھرڈ کلاس مسافر
خانے میں"

خدا کسی شخص کو جاڑے کے موسم میں فیض آباد نہ لے جائے۔
کیونکہ یہاں جاڑا قہرِ خدا بن کر نازل ہوتا ہے۔ ہم نے مسافر
خانے کے ایک صوفیانہ گوشہ میں بستر اس طرح بچھا دیا۔ گویا
ہم کہیں کے بڑے ہی تہجد گزار پیر صاحب ہیں۔ اور اب صبح
تک ہو حق ہی کرتے رہینگے + اِدھر اُدھر دیکھا۔ تو کچھ ہندو
سادھو مارے جاڑے کے گناہوں کی گٹھریاں بنے پڑے
گنگنا رہے تھے۔ جو علامت تھی اس امر کی کہ ہمیں سردی ستا
رہی ہے۔ مگر افلاس سے ایک ایک لحاف بھی نہیں + غرض
کوئی دس بجے ہونگے۔ کہ مسافر خانے کے ایک گوشہ سے آواز

آئی۔ "ارے مار ڈالا۔ ارے رحم کیجئے۔ ارے توبہ ہے! نہ رہا گیا اور تسبیح بجاتے ہوئے پہنچے اس طرف + کیا دیکھتے ہیں کہ ریلوے پولیس کے خاص الخاص ہندوستانی داروغا جی ایک برہنہ مسافر کو بے تحاشا مار رہے ہیں۔ اور وہ کہہ رہا ہے +

حضور کا ہیور کا رہنے والا ہوں۔ سخت مزدوری ملتی نہیں۔ بچے بھوکے مرتے ہیں۔ اور جیتے کو لٹنا نہیں۔ مزدوری کرنے آیا ہوں۔ صبح ہوتے ہی چلا جاؤنگا +

مگر یہ ہندوستانی داروغا جی اس فریاد پر جو کچھ فرما رہے تھے۔ وہ یہ کہ

"نائیں نائیں ڈیم کالا آدمی۔ تم چور ہے۔ چلا جاؤ مسافر خانہ میں سونے کا حکم نائیں"

یہ پہلا موقع تھا۔ جب ہم نے یہ کالا آدمی اپنی آنکھ سے دیکھا لیکن ساتھ ہی خوف پیدا ہوا کہ اب کہیں ہمارا بستر نہ اٹھایا جائے۔ کیونکہ یہ ہیں پولیس والے۔ اور یوں بھی ان کی ہر حرکت الٹی اور قانون کے خلاف ہی ہوا کرتی ہے + مثلاً یہ لوگ رات کو رعایا کی نگرانی اور حفاظت یوں کرتے ہیں۔ کہ رعایا کے سوتے ہوئے لوگوں کو اٹھا کر اپنی حفاظت کراتے ہیں۔ اور صاف صاف کہتے پھرتے ہیں۔ کہ "جاگتے رہو" ورنہ ہونا یوں چاہیئے تھا کہ "سوتے رہو۔ مطمئن رہو" + آخر بستر اٹھا کر اسٹیشن کے فرسٹ کلاس ویٹنگ

روم کا رُخ کیا۔ اور سوچا کہ اب یہ مسافرانہ انکسار تو کرو ترک۔ اور بیٹھا دوسکہ اپنی علمی وقار کا + یہ تہیّہ کر کے کھول دیا دروازہ فرسٹ کلاس ویٹنگ روم کا + دیکھا کہ ایک سفید آدمی قیمتی کمبلوں میں خواب فرما رہے ہیں + یہ دیکھ کر غصّہ آیا۔ کہ حاکم قوم کے افراد تو یوں آرام کریں اور محکوم یوں جاڑے مریں + بس اسی طیش میں ترکیب یہ کی۔ کہ ایک کرسی کو ویٹنگ روم میں اس زور سے گھسیٹا۔ کہ یہ سفید آدمی چمک کر کھڑے ہو گئے۔ اور فرمایا "کون ہے تم؟" ہم نے آہستہ سے کہا۔ "وہی شردھانند والے عبدالرشید" + مگر یہ نہ سمجھے اور پھر فرمایا۔ "ول کون ہے تم؟" تو ہم نے کہا۔ "عزتی میں ضیاء الملک۔ فارسی میں حضور۔ اردو میں مُلّا رموزی۔ انگریزی میں جرنلسٹ اخبارات میں موجد گلابی اُردو۔ رئیسوں میں مُلّا صاحب۔ غریبوں میں مُلّا جی۔ عوام میں مولانا۔ دفتر میں منشی جی۔ دوستوں میں مُلّا۔ شاگردوں میں قبلہ۔ مریدوں میں حضرت۔ اور گھر میں وہی نئے کیے آبا + "اس نام کو سُن کر رہ گئے حیران۔ تو ہم نے انگریزی میں کہا کہ ہماری تحقیق تو کرو ختم اور اب ؎

"تم اپنا منہ اُدھر کر لو ہم اپنا منہ اِدھر کر لیں"

کیونکہ گو ہم انگریزی زبان جانتے ہیں۔ لیکن اس میں گفتگو کرنا اپنی مادری زبان کی توہین سمجھتے ہیں + تو یہ سفید رنگ والے بولے۔ کہ ہیں عزتی زبان بھی جانتا ہوں + ان کا یہ کہنا تھا۔ کہ ہم نے فوراً

مابعد شروع کر دیا۔ اُنہوں نے بسوال جرح کہا کہ میرا نام جی۔ وی رسولڈ ہے۔ میں اکسفورڈ یونیورسٹی کا ایم۔ ایس سی ہوں۔ امریکہ میں اشتہار نویسی کی تعلیم پائی ہے اور پانچ سال سے لنڈن کے مشہور عالم اخبار "ڈیلی میل" کے شعبۂ اشتہارات کا ایجنٹ ہوں + میرا مستقر مصر کا دار الحکومت قاہرہ ہے اور اسی لئے میں عربی زبان خوب جانتا ہوں + اس پر ہم نے کہا "تو آیئے بسم اللہ۔ کیجئے کوئی سوال۔ پھر سُنئے اس کا جواب" + فرمایا "یہاں اسٹیشن پر اس وقت چائے بھی ملیگی یا نہیں؟" ہم نے کہا۔ یہ تو دریافت کیجئے کسی ریلوے قلی سے۔ ہم سے اگر بات کرنا ہے تو لکھے پڑھے انسان کی سی بات کیجئے" + اس پر رسولڈ مسکرائے۔ مگر مسکرا کر قیامت ہی ڈھائی۔ کہ لگے ہندوستانی سیاسیات کے اہم حصوں پر سوالات کرنے + اس وقت خیال پیدا ہوا کہ دیکھو ان انگریزوں کے مذاق کو۔ اور دیکھو ان کی سیاسی اور بین الاقوامی مسائل سے دلچسپی کو یہ خرافیات کی طرف رغبت ہی نہیں کرتے ۔ تنگ آکر ترکیب یہ کی۔ کہ دو تین لمبی لمبی جمائیاں لیں۔ اور اُن سے کہا کہ قبلہ اب رات کے بارہ بجے ہیں اس لئے اب ؎

"تم اپنا منہ ادھر کر لو ہم اپنا منہ ادھر کر لیں"

شب بخیر صبح دیکھا سُنا جائیگا + مگر وہ کاہے کو باز آتے تھے فوراً سگرٹ پیش فرما دیا + اب تو ہم سمجھ گئے کہ ہوئی صبح + چارو

ناچار جواب دینا شروع کیا۔ مگر چال یہ چل گئے کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کی خرابیاں گن گن کر سنانا جو شروع کیں۔ تو انگریزی خون میں اشتعال سا ہونے لگا + ادھر لحاف کو یاؤں پر ڈالا۔ اور پھر آہستہ سے اُسے گھٹنوں تک لے آئے + پھر سینہ تک اور جب اطمینان ہو گیا کہ لحاف کا اب ایک ہی زینہ باقی رہ گیا ہے۔ ادھر رمبولڈ صاحب بھی کچھ خفا ہو کر مضمحل سے ہو رہے ہیں۔ تو ہم نے ایک دم .... اس پر رمبولڈ بے ساختہ ہنس پڑے اور فرمایا "یہ کیا؟" تو ہم نے کہا۔ "بس قبلہ اب سے "تم اپنا منہ اُدھر کر لو ہم اپنا منہ ادھر کر لیں"

صبح ہوئی تو ملازمت کی درخواست لکھی۔ قابلیت کے سرٹیفکیٹ شامل کیے۔ اور بھائی یقین مانیے کہ ایک ایک محکمے اور دفتر میں گئے۔ ہر جگہ یہی جواب ملا کہ دو سال سے بی۔ اے پاس ہمارے ہاں امیدوار ہیں۔ مگر جگہ خالی نہیں + اتفاق سے مل گئے ایک گلابی اُردو کے قدردان + فرمایا۔ "مولانا نوکری دوکری کہاں ملتی ہے؟ فی الحال پان سگرٹ کی دکان لگا لیجے۔ اللہ رزاق ہے کیونکہ آج ہندوستان کا کوئی شہر نہیں۔ جہاں کالا آدمی بی۔ اے پاس کر کے بھی ادارہ نہ چلا رہا ہو۔ اس لئے عافیت اسی میں ہے کہ تجارت کیجے۔ جس سے ہم مالدار ہو جائینگے اور جب مالدار ہو جائینگے۔ تو بغیر تحقیق قابلیت کونسل کی ممبری کے ووٹ بھی مل جائینگے

(رسالہ نگار بھوپال فروری ۱۹۲۷ء)

مضمون نگاری

تحریر کو قوموں کے عروج و زوال سے جو اہم علاقہ ہے۔ اس کی نسبت اس چودھویں صدی میں ایک مضمون نگار میں ذیل کی قوتوں کا ہونا ضروری ہے ؎

۱۔ وہ علوم متعارفہ کا عالم ہو ؎

۲۔ وہ مخلوقات عالم خصوصاً انسان صاحب کے خواص سے کلیتہً واقف ہو ؎

۳۔ وہ چار بڑی اور علمی زبانیں جانتا ہو یا جانتی ہو۔

۴۔ اس میں احساس۔ تاثر۔ بصیرت۔ نقد و تنقید اور حافظہ کی قوتیں غیر متعمولی ہوں ؎

۵۔ جس زبان کا وہ مضمون نگار ہو۔ اس میں انسانی خواص و حالات کو مؤثر صورت میں بیان کرنے پر قادر ہو۔

۶۔ وہ ایک خیال کو ظاہر کرنے کے لئے الفاظ کا کافی ذخیرہ رکھتا ہو یا رکھتی ہو ؎

۷۔ وہ دنیا جہاں کا سفر کر چکا ہو یا کر چکی ہو ؎

۸۔ وہ افکار و آلام سے محفوظ ہو ؎

Taj Tahir Foundation

۹- اُس کے مزاج میں اعتدال ہو +

مضمون نگاری کی یہ وہ قطعی اور ضروری شرطیں ہیں جنہیں وہابی۔ قادیانی۔ اہل حدیث اور بریلی والے بھی مانتے ہیں۔ اور انہیں چیزوں کے بل پر آج یورپ کی مضمون نگاری ترقی کے فلک الافلاک پر پہنچی ہوئی ہے + اب سوال یہ ہے۔ کہ اُردو مضمون نگاری نے ان اعتبارات سے کس قدر ترقی کی ہے۔ اور اُس کے مضمون نگار مضمون کس طرح لکھتے ہیں؟

دیوبند اور علی گڑھ میں جس قدر علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ اگر اُن کے طلبہ میں مضمون نگاری کی مشق اور صلاحیت بھی اُتنی ہی ہوتی۔ تو یہ لوگ اپنے دماغ و قلم سے اُردو زبان اور اُمت اسلامیہ کی وہ خدمات انجام دیتے۔ جو سان گمان میں بھی نہیں + مگر ان لوگوں میں بعد تحصیل علوم دو قسم کے ارمان پیدا ہوتے ہیں۔ ایک کسی مدرسہ کا "صدر مدرس" ہو جانا۔ دوسرے کہیں کا۔ ڈپٹی کلکٹر ہو جانا + اور جو ان دونوں کے مقابل کوئی صاحب مضمون نگار نکل آئے۔ تو صرف اس طرح کہ ہمارے ایک دوست نے اردو کا رسالہ ایک دم جاری کر دیا اور مقالۂ افتتاحیہ میں دن دھاڑے شبلی علیہ الرحمۃ کی مشہور کتاب "الفاروق" کے تین صفحات اپنے نام سے نقل کر ڈالے۔ جب لکھنؤ کے ایک اخبار میں سعید انصاری نے اس کی قلعی کھولی تو بیچارے آج تک "ضرب خفیف"

بنے پھرتے ہیں + واقفیت کا یہ حال کہ لکھنؤ سے ذرا آگے والے شہر
کے ایک ایڈیٹر صاحب نے لکھا کہ :-
بندرگاہ قاہرہ سے آج سعد زاغلول جہاز۔ "پر سوار ہو گئے"۔

مضمون نگار لیڈر

قومیات ہند میں سب سے اونچا مرتبہ لیڈروں
کی مضمون نگاری کا ہے اور ویسے بھی یورپ
اور دوسرے متمدن ممالک میں بادشاہ سلامت کے بعد لیڈروں
ہی کی تقریر و تحریر معزز و مقتدر سمجھی جاتی ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے
کہ ہندوستان میں لیڈر وہی جو اپنے ساتھ روزانہ ایک نئی تحریک
لے کر نکلے۔ مثلاً اگر شردھانند جی "شدھی" کی تحریک فرمائیں تو
مالوی جی لیڈر ہی نہیں۔ اگر وہ "سنگٹھن" کو نہ لے دوڑیں۔
اگر ڈاکٹر کچلو۔ علی غول بنا ڈالیں۔ تو ڈاکٹر منجی ڈاکٹر صاحب ہی
نہ رہیں۔ اگر وہ "مہا بیر دل" نہ پیدا کر دیں۔ حالانکہ پہلے زمانہ
میں لیڈری کے لئے صرف ایک دل ہلا دینے والی تقریر اور
گورنمنٹ کو "بے نقط تحریر" کافی سمجھی جاتی تھی + اب البتہ
کچھ دن سے لیڈری کے ساتھ ایڈیٹری بھی شامل ہو گئی ہے
چنانچہ دیکھ لو بڑے لیڈر صاحب سے لے کر چھوٹے لیڈر
صاحب تک ایک نہ ایک اخبار کے ایڈیٹر بنے ہوئے ہیں۔
اور اسی لئے آج کل ان لوگوں کی مضمون نگاری سب سے
پہلے ملاحظہ کے قابل ہو گئی ہے +

ہوتا یہ ہے - کہ لیڈر صاحب "کوٹھی" یا "ٹیلیفون والے مکان" سے کم حیثیت والے مکان میں نہیں رہتے - کیونکہ جناب اُن کے پاس اخبار ریوٹر کے نہیں - تو وہی والی ایسوسی ایٹڈ پریس کے نمائندے تو سوال کرنے کبھی کبھی آ ہی جاتے ہیں + باوجود تحریک مقاطعۂ مالِ برطانیہ ان لوگوں کے مکانوں میں ایک کمرہ "ڈپٹی کلکٹر" کے کمرہ کے مشابہ ہوتا ہے - اس میں الماریاں - آئینے - برقی روشنی - برقی پنکھا - میز - کرسی - تصاویر - اور ایک طرف صابون واسترہ بھی رکھا ہوتا ہے + پس جب لیڈر صاحب کسی جلسہ میں اپنی تحریک کو ناکامیاب دیکھ کر آتے ہیں تو مضمون نگاری شروع کر دیتے ہیں اور جو منہ میں آتا ہے وہی لکھ مارتے ہیں + ان کی تحریروں کا طول ایک سے لیکر ۱۰ کالم تک ہوتا ہے - ان کی تحریریں زیادہ تر ذاتی بغض - حسد اور غرض پر مبنی ہوتی ہیں - اُن کے سامنے قوم کا کوئی متفقہ مقصد نہیں ہوتا - بلکہ ان کی ہر تحریر وقتی جوش کی نتائج ہوتی ہے - اور اسی لئے ان کے اندر زبان کی بے شمار غلطیاں ہوتی ہیں - اور کہیں کہیں سیدھی نہیں تو ترچھی بھی سنا دیتے ہیں + ان کے مضمون کا عنوان نہیں ہوتا - بلکہ اپیل یا پیغام کے نام سے شائع ہوتا ہے - مثلاً "سوامی جی کا پیغام جاتی کے نام" اور "مولانا کا اپیل قوم سے" + انداز تحریر نہایت پیغمبرانہ ہوتا ہے - مثلاً کہیں کہیں یہ لوگ ہم لوگوں سے "ندائے غافلاں"

بھی کہہ دیتے ہیں۔ ان کی تحریر میں لیڈرانہ وقار۔ متانت پختگی
اور تاثیر ان کے شایانِ شان نہیں ہوتی۔ یہ لوگ مضمون لکھنے
کے بعد انگریزی چائے۔ بسکٹ۔ مکھن اور فروٹ کھاتے ہیں۔

مضمون نگار ایڈیٹر

یہ ہے وہ مقدس طائفہ جس کی
بے تحاشا مضمون نگاری سے آج برطانیہ کلاں و آئرلینڈ کا
لڑکا لڑکا اور لڑکی لڑکی تک کانپ رہا ہے اور کانپ رہی ہے۔
مضمون نگار ایڈیٹروں میں زیادہ حصّہ علی گڑھ کے اُن جوان
ہمّت اور صاحب ہوش و خرد نوجوانوں کا ہے جو بغیر علم دین
کی آگاہی کے ہمارے نام نہاد مولوی صاحب سے کہیں زیادہ
ملک و ملت اور مذہب کا درد احساس رکھتے ہیں + حق تو یہ ہے
کہ ایڈیٹروں اور صرف ایڈیٹروں کی مضمون نگاری ہے جو زبان
مذہب۔ ملک اور قوم کے لئے مفید و مؤثر ہے + ان کی مضمون
نگاری نے وہ اثرات پیدا کئے ہیں جو ڈاکٹر ٹیگور کے ملفوظات
کر سکتے ہیں۔ اور نہ برٹ مولوی صاحب کی "تنبیہ الغافلین"۔
مگر ناقدری کا یہ عالم ہے کہ ڈاکٹر ٹیگور آج بھی شاہانِ فرنگ کے
مہمان بنے پھرتے ہیں اور یہ بیچارے ایڈیٹر ہر وقت دفعہ ۱۴۴
کی ضربین کھاتے ہیں + یہ لوگ اپنے والدین کی دولت سے لکھتے
پڑھتے ہیں اور پھر محض فرائض کے احساس پر ارکان اخبار کی
نوکری کرتے ہیں۔ بے نہایت و بے پایان مصائب برداشت

کرتے ہیں - مگر اظہارِ حق اور خدمتِ خلق کے لئے پھر بھی تیار رہا
کرتے ہیں + یہ لوگ گھر سے صرف دال روٹی کھا کر پیادہ پا چھتری
لگائے ہوئے اخبار کے دفتر میں آجاتے ہیں - اور قوم کی ہر ضرورت
پر لکھتے ہیں + مالک اخبار یا قوم کی طرف سے انہیں کوئی صلہ
نہیں ملتا - البتہ کبھی کبھی کوتوال صاحب شہر بلا کر ڈانٹ دیا
کرتے ہیں + یہ لوگ آنکھوں پر عینک ضرور لگاتے ہیں - شام
کے وقت تفریح کا ہوا اور بازاروں میں ذرا گھوم لیتے ہیں - بعض
بالاخانوں پر بھی ہو آتے ہیں - جو اس قدر خدا ماننے کے بعد کوئی مضائقہ
کی بات نہیں + ان کی تحریروں میں زبان - اور قواعد کی غلطیاں
ہوتی تو ہیں مگر کثرتِ کار کی وجہ سے معافی کے قابل ہیں لیکن اسی
کے ساتھ ان کے قلم سے آئے دن نئی نئی اصلاحات - ناموں اور
الفاظ کا اضافہ بھی ہوتا ہے - جو زبان کی ترقی کا باعث ہے + ان
کے مضامین میں "جوشِ انگیزی کا حصہ" غالب ہوتا ہے - جو تحریر
کا صحیح مقصد ہے + ان کے دماغوں کو نیا مضمون سوچنے سے
کسی وقت فرصت نہیں ملتی + یہ لوگ میلے اور گندے کپڑے
پہنتے ہیں - ان کی شیروانیوں سے ان کی قمیصوں کی آستینیں نکلی
ہوئی نظر آتی ہیں - یہ لوگ شیروانی کے بٹن نہیں لگائے جو
ان کے علمی انہماک کا صحیح ثبوت ہے - ان کے املا کی غلطیاں
کاتب کے سر منحوس دی جاتی ہیں + ان کی تحریروں میں دو باتیں

نہایت غیر ذمہ وارانہ ہوتی ہیں ایک یہ کہ صرف گورنمنٹی قسم کے ہیڈ مولوی صاحب کی بنائی ہوئی قرآنی آیات کو مضمون میں جہاں دل چاہا لے آئے۔ دوسرے اگر کسی لیڈر یا جماعت سے اختلاف ہوگیا۔ تو تحریر میں متانت قائم رکھنے کی جگہ "غیر طرح" سنانے پر بھی اتر آتے ہیں۔ اور ان کی اسی حرکت سے تو یہ انگریز لوگ بگڑ جاتے ہیں۔ باقی سب طرح خیریت و خیر عافیت ہے ؂

نوجوان انگریزی دان مضمون نگار

اسلامیہ کالج پشاور کے ہوں یا انجمن حمایت الاسلام لاہور کے۔ علیحدہ ضرور لگاتے ہیں۔ ان لوگوں کی مضمون نگاری انٹرنس کے درجہ سے شروع ہو جاتی ہے + یہ لوگ انگریزی ناولوں کے بڑے عاشق ہوتے ہیں۔ اور اس لئے شروع شروع میں ناول ہی کا ترجمہ فرماتے ہیں۔ اور کسی رسالہ کو یہ ترجمہ "بغرض اشاعت" بھیج کر لکھ دیتے ہیں۔ کہ اگر پسند نہ ہو تو جلد واپس کیجئے۔ بعض اصلاح کی تاکید بھی فرما دیتے ہیں + ایسے نوجوان مضمون نگاروں سے ایڈیٹر صاحب "نگار" بے حد تنگ اور ناراض ہیں۔ اور یہ ایسی ہی فوجداری کی مضمون نگاری سے جملہ رسالوں نے واپسی اور جواب کے لئے۔ ایک آنے کے ٹکٹ کی شرط قواعد میں لکھ دی ہے + مگر یہ کہاں مانتے ہیں؟ مضمون ارسال کرتے ہی رسالہ مفت جاری کرنے کی تنبیہ کی جاتی ہے +

ان لوگوں کی مضمون نگاری کے موضوعات فن تاریخ میں اورنگ زیب عالمگیر۔ محمود غزنوی۔ ادبیات میں از غالب و مومن کی شاعری بیان حالی و سر سید کا طرز تحریر۔ سیاسیات میں گورنمنٹ برطانیہ بفضل ایزدی آئرلینڈ و ماورائے بحر کو چند بے نقط تک محدود ہوتے ہیں + ایک ٹولی صرف "ٹیگوریات" کے ترجموں اور فسانوں کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ ان لوگوں کے پیش نظر خدمت سے زیادہ شہرت ہوتی ہے۔ اس لئے زبان کی صحت اور فصاحت وسلاست وغیرہ کی پابندی نہیں فرماتے ہیں۔ اس محترم طبقہ کے لوگ پرانے مضامین چرا لینے سے بھی نہیں چوکتے۔ مگر مضمون نگارانہ غرور اس قدر بڑھ جاتا ہے۔ کہ عینک لگا کر شام کو کسی پر فضا مقام پر ضرور جاتے ہیں + نصف آستین کی قمیص پہنکر مضمون لکھتے ہیں اور دنیا کا کوئی حصہ مضمون نگاری باقی نہیں رکھتے۔ ان کے مضامین میں صرف شوکت لفظی ہوتی ہے۔ اور بس ..... +

عربی دان مضمون نگار

دنیا جانتی ہے۔ کہ عربی کا جو نصاب اس وقت ہندوستان میں پڑھایا جا رہا ہے۔ وہ بے حد ناقص اور بیکار ہے۔ پھر بھی اس میں جو علوم ہیں وہ ایک ذی ہوش اور صاحب احساس انسان کو ایم۔ اے سے زیادہ قابل لائق بلکہ سقراط بنا سکتے ہیں۔ مگر اس کو کیا کہئے کہ یہ

عربی کے طلبہ پورا درس نظامی چٹ کر جاتے ہیں۔ مگر چاہو کہ ملازمت کی درخواست بھی قابلیت سے لکھ لیں۔ تو ناممکن + ان میں تو بڑا قابل آدمی بس وہی سمجھا جاتا ہے جو کہیں کا صدر مدرس بن جائے۔ مضمون نگاری کی صلاحیت ان میں نہ پیدا ہوئی ہے اور نہ ہو + وجہ یہ ہے کہ "خود بڑے مولوی صاحب" بھی کورے ہی دھرے رہتے ہیں۔ عمر بھر عربی پڑھاتے ہیں مگر خود عربی زبان میں ایک منٹ بھی گفتگو نہیں کر سکتے + دوسری وجہ یہ ہے کہ جب سے اخبار پائنیر نے لکھ دیا ہے کہ حاکم برہمن مذہب صرف اعتقادی قصہ ہے اس وقت سے مسلمانان ہند نے مذہبی تعلیم اور عربی زبان چھوڑ کر بیرسٹر ایٹ لا ہونا شروع کر دیا ہے۔ اب عربی پڑھتے ہیں تو شہر بخارا اور افغانستان کے طلبہ۔ لہذا اُن سے اُردو زبان میں تقریر و تحریر کی امید ایسی ہے جیسے پارلیمنٹ والوں سے سوراج کی۔ ہاں زمانے کے موجودہ فولادی گھونسہ نے ان طلبہ کے دماغوں میں جو خفیف سی سنسنی پیدا کر دی ہے اور اس کے اثر سے ان میں ماشاء اللہ مضمون نگار پیدا ہونے لگے ہیں۔ سو وہ بھی فی سبیل اللہ نہیں۔ بلکہ منشی فاضل اور مولوی فاضل کی ملازمانی ڈگریوں کے حصول تک اور اس کے بعد پھر وہی۔ "صدر مدرسی" + غرض مضمون نگاری کی ابتدا جمعرات والے "مذاکرۂ علمیہ"۔ عرف ڈیبٹ سے ہوتی ہے۔ جہاں ظہر

یا عشا کی نماز کے بعد جمع ہو کر کوئی تقریر کرتا ہے اور کوئی مضمون
سناتا ہے رسودہ بھی کانپتے ہوئے جسم اور لرزتی ہوئی زبان سے +
مضمون ہمیشہ الف خانی روشنائی اور کلک کے قلم سے لکھا جاتا
ہے مضمون میں تازہ حالات و واقعات سے بحث نہیں ہوتی بلکہ
اس میں بارش کے فوائد تاویلیوں کے عقائد باطلہ اور احناف کے
عقائد صادقہ وغیرہ سے بحث ہوتی ہے - اور جو کہیں درمیان میں
خود اپنے متعلق کچھ کہنا ہوا تو اپنے نام کو میں یا ہیچمدان کہہ کر نہیں پکارتے
بلکہ خود کو کمترین - فقیر - ناچیز - عاصی اور مسکین کے الفاظ سے یاد
فرماتے ہیں + نام کے آخر میں عفی عنہ، غفرلہٗ یا حنفی اور نقشبندی
ضرور لکھینگے + انداز تحریر ایسا کہ سن کر بجائے اثر کے غنودگی طاری
ہو جائے - مضمون کے ہر جملہ اور ہر فقرہ کو صرف و نحو سے حل کرنا
جانِ انشا سمجھتے ہیں - تیاری کے وقت کوئی جھگڑا نہیں کرتے -
بلکہ سیدھی طرح چار پائی پر بیٹھ کر لکھنا شروع کر دیتے ہیں مضمون
کی لفظی آرائش کے لئے مادھو راؤ اور غیاث کے جملہ لغات جمع
کر دیے جاتے ہیں اور یہ ایسی ہی مضمون نگاری ہوتی ہے عربی کے
طلبہ کی - جس سے الحمد للہ اردو زبان اور اردو رسائل و جرائد خالی
نظر آتے ہیں + بس ہم تو قائل ہیں - قبلہ مولانا احمد سعید صاحب
دہلوی ناظم جمعیۃ العلماء کے جو خوب ہی لکھتے ہیں - غفرلہٗ +

بوڑھے مضمون نگار

گو غدر ۵۷ء میں ہندوستان کے

بے شمار مضمون نگار بھی مارے گئے مگر خدا کے فضل سے اب بھی
ہمارے دادا صاحب مرحوم کی عمر کے مضمون نگار موجود ہیں۔ اور
کمال یہ ہے کہ نظام حیدر آباد کے وزرائے سلطنت انہیں اب بھی
وظائف و مناصب سے سرفراز فرما رہے ہیں۔ اور گو یہ لوگ اگلے
زمانے کے مضمون نگار ہیں۔ مگر قومی درد اس قدر کہنہ ہے۔ کہ اب
بھی لکھے جاتے ہیں + خیر ہمارا لینے ہی کیا ہیں؟ اپنی ہی عمر عزیز برباد
کر رہے ہیں۔ بس فرق یہ ہے کہ یہ لوگ ضعف اور پیری کی وجہ
سے انگریز بھائیوں کے مظالم پر اس زمانے سے نہیں لکھتے۔ جس
زمانے سے کبھی مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خاں لکھا کرتے تھے۔
یہ حضرات مضمون لکھنے سے پہلے "تازہ دم" ہونے کے لئے حقہ استعمال
فرماتے ہیں + ان میں ایک صاحب تو "گولی" بھی کھا لیتے ہیں جس
کے اثر سے مضمون لکھتے لکھتے کبھی کبھی خود ہی چونک پڑتے ہیں۔
یا پھر مسلسل غنودگی اور جمائیوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ مگر
لکھے جاتے ہیں + ان کے مضمون کا کاغذ پے در پے کھانسی کی
وجہ سے غالب کے رنگ کا سرخ "پرافشاں" بن جاتا ہے + ان
کے پیران پیر دستگیر اٹاوہ میں رہتے ہیں۔ امام اوّل لاہور میں اخبار
زمیندار کے سامنے اور خلیفۂ اوّل لکھنؤ میں مقیم ہیں + ان کے پچھلے
مضامین کا مقصد ملکہ وکٹوریہ کی خوشنودی ہوا کرتا تھا۔ اور موجودہ
مضامین کا مقصد "کلکٹر ضلع" کی رضا جوئی ہوتا ہے + ان میں کے

ایک صاحب گورکھپور اور دوسرے جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد میں چارپائی پر لیٹ کر بھی مضمون لکھتے ہیں + ان کی تحریر میں تجربہ۔ استدلال تحقیق غیر ضروری نہیں تو ضروری بھی نہیں ہوتی + ان کی تحریر میں بجائے بیداری اور جوش کے اس امر کی تاکید ہوتی ہے۔ کہ "تقریر نہ کرنا تاثیر دکھا + یہ لوگ ہر معاملہ میں سرسید علیہ الرحمۃ کی تحریروں کا حوالہ ضرور دیتے ہیں۔ البتہ تحریر میں انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے انگریزی الفاظ نہیں ہوتے۔ بلکہ خالص اردو زبان لکھتے ہیں جس میں کہیں کہیں حضرت داغ دہلوی اور امیر مینائی کے اشعار ضرور ٹھونس دیئے جاتے ہیں +

ہماری مضمون نگاری

اگر یہ صحیح ہے۔ کہ بڑے بڑے لارڈ "آپریشن" سے شفاخانوں میں مرجاتے ہیں۔ اگر ہندوستانی راجے مہاراجے تغوتِ باہ اور طلا کی گولیوں سے ہلاک ہوتے رہتے ہیں۔ اگر ہندوستانی قلی صاحب لوگوں کی ٹھوکر سے مرجاتے ہیں۔ اگر سرحدی قبائل ہوائی جہازوں سے فنا ہوتے ہیں۔ تو دیکھ لینا ہم کسی نہ کسی دن مضمون نگاری میں . . . یہ ہوجائینگے۔ اور یار لوگ اِنا اللہ پڑھ کر فارغ ہوجائینگے + آپ ہی غور کیجئے کہ یہ بھی کوئی مضمون نگاری ہے کہ چوبیس گھنٹے قلم دربغل اور کاغذ بدوش پھرتے رہتے ہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ ہم نے تعلیم تو معقول ہی پائی ہے۔ مگر وہ تو کہئے کہ ؎

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

کے موافق جہاں دنیا میں کسی نے غلطی کی - اور ہم نے قلم سنبھالا +
اب اگر مضمون نگاری میں "آمد" اور "آورد" کوئی چیز ہے - تو ہم
کہتے ہیں کہ ہم آمد سے بہت زیادہ کام لیتے ہیں اور وہ تو قدیم سے
مالداری کی وجہ سے کچھ دن سے خواجہ حسن نظامی صاحب کو "مصور
فطرت" کہہ دیا ہے - ورنہ اصل میں "مصور فطرت" تو ہم تھے جب کہ
ہم ہر شخص کا حلیہ کھینچ کر رکھ دیتے ہیں عبدالرحمن چغتائی سے کیا
کم ہیں - اور ہمارا کونسا مضمون ہوتا ہے - جو "عمل چغتائی" کا
کام نہ دیتا ہو؟ اور اسی حلیہ نگاری کی وجہ سے اکثر لیڈر لوگ
ہمیں اپنے داموں سے ہوٹل میں تو مہمان رکھتے ہیں - مگر کبھی اپنے
گھر میں نہیں ٹھیرنے دیتے - کیونکہ جانتے ہیں کہ اگر ہمیں وائسرائے
بہادر کی بھی کوئی کمزوری نظر آجائے - تو ہم اس پر کچھ لکھے مارے
سے نہیں رہ سکتے + اور وہ تو اللہ بخشے بڑے مولوی صاحب ہیں
منع کرتے رہے - ورنہ اب تک تو ہم "باغیانہ مضامین" بھی لکھ
چکے ہوتے - ادھر ویسے ہی ہمیں جیل خانوں کی آب و ہوا موافق
نہیں - کیونکہ ہم نے بڑے بڑے لیڈروں کو دیکھ لیا - کہ جوں
ہی جیل خانے سے واپس آئے - یا تو سوراج اور خلافت کا کام
ہی چھوڑ بیٹھے یا پھر انگریزوں پر پہلا سا دندنانا چھوڑ دیا +
اور بڑی وجہ یہ ہے کہ ایسے مضامین کی وہ بھی مخالفت کرتی

ہیں + الغرض ہمیں آمد ہوتی ہے تو مضمون شروع کرتے ہیں اور
مضمون کا عنوان لکھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ کیونکہ ننھے میاں کی ایک
ہی چیخ سے سارا مضمون خبط ہو جاتا ہے + پھر سوچتے ہیں۔ مگر
جب نہیں آتا تو قلم کو میز پر رکھ کر آسمان کی طرف دیکھتے ہیں۔
اور حیدر آباد کے منصرم وظائف کو بد دعا دیتے ہیں۔ کہ اگر وہ
ہمارے وظیفے کی بھی کچھ فکر کر دیتے تو کیوں اس وقت دماغ
پریشان ہوتا + پھر حقہ پیتے ہیں۔ مگر مضمون سمجھ میں نہیں آتا
تو سیٹی بجاتے ہیں + پھر آئینہ میں خود کو منہ چڑاتے ہیں کبھی
بالوں کو سنوارتے ہیں۔ کبھی قلم کو پیشانی پر رگڑتے ہیں۔ کبھی
کوئی مصرعہ گنگناتے ہیں۔ کبھی بے وجہ مسکراتے ہیں۔ اتنے
وقفہ میں دفتر کا وقت ہو جاتا ہے۔ اور چھڑی اٹھا کر دفتر چلے
جاتے ہیں۔ شام کو آتے ہیں۔ تو ان کے کاموں میں مصروف ہو
جاتے ہیں۔ یعنی سودا سلف لینے جاتے ہیں۔ اور اگر کوئی بھی نہ
ہو تب بھی وہ ننھے میاں کو یہ کہہ کر دے دیتی ہیں۔ کہ لو ذرا
انہیں باہر ٹہلاؤ یہ ننھے میاں کو۔ "ذرا باہر ٹہلانے کا معاملہ"
مغرب تک جاری رہتا ہے۔ اور اگر کسی دن دنیا بھر کا کوئی کام
بھی باقی نہ رہے۔ تو وہ ہماری خوش دامن صاحبہ کے ہاں خیریت
معلوم کرنے بھیج دیتی ہیں۔ مگر ہم بھی کسی مسجد میں بیٹھ کر مضمون
پورا کر ہی لیتے ہیں۔ اور آکر کہہ دیتے ہیں کہ تمہاری والدہ نہایت

Taj Tahir Foundation

اچھی ہیں۔ تمہیں درجہ بدرجہ دعا کہی ہے اور ننھے میاں کو پیار + یہ کہہ کر پھر وہ عنوان لکھا ہوا مضمون شروع کرتے ہیں۔ کہ محلے والے یار دوستوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے + اب اگر محلے والوں سے نہ نبھیں۔ تو اُن کے "ترک موالات" سے موت مٹی خراب ہونے کا خوف۔ اس لئے عشا کی نماز تک مضمون نہیں لکھ سکتے + بعد عشا جب وہ سو جاتی ہیں تو مضمون شروع کرتے ہیں۔ اور جو کبھی جمیلا رونے لگی۔ تو انہوں نے بغیر گفتگو کے .... ننھے میاں کو ہمارے بستر پر لا کر ڈال دیا۔ اور خود جمیلہ کو لے کر سو گئیں + اب ہم ہیں کہ مضمون و ضمون چھوڑ کر ننھے میاں کو بارہ تیرہ بجے رات تک لوریاں دیا کرتے ہیں۔ اور کچھ دیر میں خود بھی خور خور کرنا شروع کر دیتے ہیں +

اس طرح لکھا کرتے ہیں اردو زبان کے مضمون نگار + اب اردو زبان کی ترقی اور تنزل کے اسباب آپ خود ہی معلوم کر لیجئے +

رسالہ بہار ستان لاہور ستمبر ۱۹۲۷ء

بیٹھی عید

اگر عید کی سی خوشی ہر وقت چاہو۔ تو تارک دنیا بن جاؤ۔ اور تارک دنیا اس شخص کو کہتے ہیں۔ جو شہر کی آبادی سے نکل کر کسی گھنے جنگل کے اونچے پہاڑ پر جا بیٹھے۔ چنانچہ اسی خیال سے ۵۔ مارچ ۱۸۸۲ء کی صبح ایک ایسے ہی پہاڑ پر ہوئی جہاں آدمی کم اور جانور زیادہ تھے + ہم بھی کاندھے پر بندوق دھرے۔ سانس روکے۔ جسم چرائے اور آہستہ آہستہ پہاڑ کی ایک ایسی سمت روانہ ہوئے۔ جس کے نشیبی حصہ میں شیر بیٹھا تھا یا کھڑا تھا۔ یا لیٹا تھا یا اونگھ رہا تھا۔ یا سو رہا تھا۔ یا چل رہا تھا۔ یا چلنے والا تھا۔ بہر حال شیر ضرور تھا۔ اس لئے کہ ساتھیوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر گھورا۔ جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ کیوں شور کرتے ہو؟ کیا اتار چڑھاؤ دیکھتے نہیں ہو۔ کہ شیر کی جگہ ہے۔ اور تم ہو۔ کہ شور کر رہے ہو؟ یہ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ڈانٹنے والے اس وقت یہ سمجھتے تھے۔ کہ بس ہم سے تو کوئی غلطی ہوتی ہی نہیں! ادھر ہم مرے جا رہے تھے۔ کہ کچھ بھی ہو۔ آج شیر کو مار کر دنیا کے پولین اعظم بن کر رہینگے + غرض ایک اونچی جگہ بیٹھ کر شیر کو اس طرح دیکھا۔ گویا وہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ اور

ہم مارے خوف کے اس سے خود کو چھپا رہے ہیں! کبھی سانس روکتے کبھی ناک بند کر کے منہ سے سانس لیتے۔ کیونکہ اکثر خشکی کی وجہ سے ناک سے ہارمونیم کے سُر پیدا ہو جاتے ہیں۔ کبھی دو زانو ہو جاتے۔ کبھی پالتی مار لیتے۔ مگر فوراً ہی خوف سے پہلو بدل لیتے + ادھر شیر سے زیادہ ڈر کھانسی کا تھا۔ کہ کہیں کھانسی نہ چل جائے ورنہ شیر تو رہا اپنے گھر یہ ساتھی مارے غصّہ کے ہم کو نہ مار ڈالیں۔ اور عذر یہ کرینگے۔ کہ تم نے کھانس کر کیوں شیر کو بھگا دیا؟ غرض کوئی پندرہ منٹ تک خوب خوب رکوع اور سجدے کئے۔ مگر شیر نظر نہ آیا۔ تو پھر اسی تہذیب و شائستگی سے سانس روکے اور قدم سنبھالے پہاڑ سے روانہ ہو کر واپسی عمل میں آئی۔ اور تمام راستہ ٹھوکر پر ٹھوکر کھاتے اتار پر اتار چڑھاؤ پر چڑھاؤ دھکے پر دھکا۔ خموشی پر خموشی۔ ہنسی پر ہنسی اور شیر نہ ملنے پر افسوس پر افسوس اور لاحول پر لاحول پڑھتے گھر پہنچے۔ تو سیدھے ڈاک دیکھنے میں مصروف ہو گئے ٭

ایڈیٹر لوگ بڑے فخر سے اپنی ڈاک کے دلچسپ حالات باوجیپ خطوط اخبار میں نقل فرمایا کرتے ہیں۔ مگر ہم بھی اپنے وقت کے ایک ہی لیٹر بکس ہیں۔ جس میں روزانہ خطوط اخبار اور رسالے چلے آتے ہیں + خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ تو مضمون طلبی میں روزانہ

کوئی ڈیڑھ درجن خطوط ہمارے نام آتے ہیں۔ جن میں یہ ایڈیٹر لوگ ہم سے ہاتھ جوڑ جوڑ کر مضمون طلب کرتے ہیں مگر وہ جو کہا ہے کہ ؎

ہر فرعون کے لئے ایک موسیٰ علیہ السلام

سو اس حساب سے ہمارے بعض ایسے مخلص ایڈیٹر بھی ہیں جو ہاتھ جوڑ کر مضمون طلب کرنے کی جگہ حکم دے کر ہم سے مضمون وصول فرماتے ہیں + پس ایسے مخلصین میں یہ جالندھری حفیظ صاحب ایڈیٹر مخزن۔ اور بٹالوی صاحب سالک۔ ایڈیٹر انقلاب بہت تیز ہیں + اب یہ ڈاکیا نہ حسن نثار" وہی ہوگا"۔ کہ آج کی ڈاک سے ان دونوں بھائیوں کے خطوط آئے + ابوالاثر مولانا حفیظ جالندھری نے مخزن کا سالگرہ نمبر ارسال فرماتے ہوئے جو خط لکھا۔ اس میں ایک تازہ مضمون کی رسید تو کیا دی۔ خاصا بتھر کھینچ مارا + ارشاد ہوتا ہے :-

"مضمون مل گیا ہے۔ پسند ہے۔ چھپیگا۔ کب؟ یہ نہیں معلوم بھلا اس کے پوچھنے کی کیا ضرورت؟

اس خط کے بعد حضرت سالک کا لفافہ کھولا۔ تو لکھا تھا:

"کچھ خبر بھی ہے؟ انقلاب کا سالگرہ نمبر نکل رہا ہے سوا سو صفحات کی ضخامت۔ اور ۲۱، ۲۲ مارچ کو چھپ چھپا کر۔ کٹ کٹا کر۔ اور سل سلا کر شائع بھی ہو جائیگا"۔

آخر میں اور قہر من الناس ہی ہیں - جن الجنۃ تو نہیں -
کہ پورا رسالہ خود بنائیں - اور احباب کو آواز دیں - کہ
تشریف لائیے رسالہ تیار ہے - اور مارچ تک آپ کا
فرض ہے - کہ ایک عدد پر لطف اور مبسوط مضمون روانہ
کر کے اس خاص نمبر میں ہمارا ہاتھ بٹائیں "
یہ دونوں خطوط پڑھ کر اندازہ کیجئے - کہ مضمون کی ضرورت ان دونوں کو
ہے یا ہمیں ؟ جو اس طرح ہم ڈانٹے جا رہے ہیں + سالک صاحب
فرماتے ہیں - اور قل اعوذ برب الناس میں فرماتے ہیں - کہ
آخر میں اور قہر من الناس ہی ہیں - من الجنۃ تو نہیں
ہیں ؟
تو اب سوال یہ ہے - کہ اگر آپ من الجنۃ نہیں - تو ہم کہاں
کے وسواس الخناس ہیں - جو ہر حال میں ایک عدد مضمون تیار
ہی کر دیں ؟ اور پھر اوپر سے ڈانٹیں بھی نہیں ؟ مگر صاحب وہ
تو کہتے ہی ہیں کہ ؎

کر نوکر نہیں تو ایڈیٹر سے ڈر

لہذا اسی وقت قلم اٹھایا - جو حاضر ہے +

یہ زمانہ ہے ہائی سکولوں کی تعلیم و تربیت کا اس لئے اب اسلامی
آداب اور مشرقی اصول تو گئے گزرے - اب تو سوسائٹی کا حکم

چلتا ہے۔ جو نہ مانے سو جاہل + پس اس سوسائٹی کے ضابطہ سے آج کل مسلمان جس طرح عید مناتے ہیں۔ وہ یہ ہے :۔

امراء کی عید

یہ تو شوکت پناہ شہنشاہ عالمگیر علیہ الرحمۃ اور اُن کے زمانے کے سلاطین اور امرائے اسلام ہی تھے۔ جو علوم دینی اور شریعت مطہرہ کی تعلیم سے بہرہ ور اور نکات شریعت کے ماہر ہوا کرتے تھے + ان کی زندگی کا ہر حصہ احکام اسلامی اور اُسوۂ رسول ﷺ کا تابع ہوا کرتا تھا۔ لیکن یہ آج کل کے "کالج یافتہ" امرائے اسلام سوائے "موٹر انجنیری" کے اور کچھ جانتے بھی نہیں۔ اور بعض تو "قل ھو اللہ" شریف میں بھی اٹک جاتے ہیں + یہ تعلیم یافتہ کی جگہ "کالج یافتہ" ان لوگوں کی علوم دین سے بے خبری کی بنا پر کہا ہے۔ کیونکہ صرف "پانیر" اخبار پڑھ لینے کی قابلیت کو "تعلیم یافتہ" کا رتبہ دینا اصلاً غلط ہے +

غرض یہ لوگ بڑے کروفر اور بڑے نخرے سے کسی شاندار سواری پر عیدگاہ جاتے ہیں + غریب مسلمان انہیں جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ تو یہ منہ سے وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ کہنے کی جگہ صرف ہاتھ اٹھا دیتے ہیں + ان کے عید کے کپڑے ایک ہزار روپیہ کی لاگت سے کم نہیں ہوتے۔ بس اسلامی کفایت شعاری تو تجہیز و تکفین ہی کے کپڑوں میں برتی جاتی ہے +

ان کی عورتیں آج کے دن ان سے بھی زیادہ ریشم و اطلس پر دولت نباہ کرتی ہیں - ان کے نو عمر سفید سفید رنگ کے لڑکے اسکول کی تعلیم کے اثر سے آج انگریزی وضع کی آرائش کا خاتمہ ہی کر دیتے ہیں - اور عید گاہ میں خاصی "نیلم پری" بن کر آتے ہیں + یہ لوگ تمام رمضان گھر میں تاش کھیلا کرتے ہیں اور ایک روزہ بھی نہیں رکھتے - عید کی نماز کے بعد ان کے گھر عید ملنے ان کی برابر کی حیثیت ہی کے لوگ جاتے ہیں - غریب مسلمانوں کو ان سے ملنے کی جرأت نہیں ہوتی + جو لوگ ان کے گھر جاتے ہیں - انہیں انگریزی وضع کے برتنوں میں سوئیاں کھلاتے ہیں - اور ہاں نیوی کٹ سگریٹ بھی ہے

ان کی عورتیں بھی اعلےٰ درجہ کے لباس میں عید کی نماز کے بہانے عید گاہ جاتی ہیں - اور راستہ میں ان کے ہمراہ اُن کا وہ نوجوان ملازم ہوا کرتا ہے - جس کے اوپر اُن کے میاں کو کامل اعتماد ہوتا ہے - اور اس سے پردہ بھی نہیں ہوتا - اور بھائی ان شرعی باتوں میں اب دھرا ہی کیا ہے؟ ذرا تعلیم نسواں کو عام تو ہو جانے دو - یہ پردہ در وہ سب طاق ہی میں رکھ دیا جائیگا - اور دیکھ لینا یہ عورتیں عید گاہ میں بھی مردوں کے شانہ بشانہ صف میں کھڑے ہونے کے مساویانہ حقوق کے لئے - آل انڈیا لیڈیز کانفرنس میں اگر تحریک نہ کریں تو ہمارا ذمہ؟ اور پھر یہ علی گڑھ

کے مولوی عبداللہ صاحب بھی اس تحریک کی تائید پر مجبور ہو گئے کیونکہ بالآخر عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دینا بھی تو ایک طرح کی "تعلیم کا میابی" ہے ؛

افسروں کی عید

کہتے ہیں کہ مرض گنج ہی نہایت مہلک اور تباہ کن مرض ہے۔ پھر اس پر اگر ناخن بھی بڑھ جائیں۔ تو ایسے انسان کی تباہی میں کوئی کسر باقی نہیں رہ جاتی ؛ بس یہی حال مسلمانانِ ہند کی انگریزی تعلیم اور اس پر کسی عہدہ کے مل جانے کا ہے۔ بڑے مولوی صاحب سے چٹائی پر بیٹھ کر علوم اسلامی کا سبق پڑھنے سے۔ لیکن جب کوٹ پتلون والے ہندوستانی پروفیسر ہوں۔ جن کے دماغ پہلے ہی مغربی اثرات سے ماؤف ہو چکے ہوں۔ تو ان کے شاگردوں کو عہدہ مل جانا خاصی مصر کی فرعونی بادشاہت ہوا کرتی ہے ؛

پس ایسے المعروف بہ مسلمان لوگ اپنے ملاقات کے کمرے کو جانماز حمائل شریف اور مکے مدینے کے نقشوں سے آراستہ کرنے کی جگہ جان رابرٹ کمپنی کی میز کرسی اور کلکٹر صاحب ضلع کی تصویر سے آراستہ کرتے ہیں ؛ ان کے ہاں عید کے دن جائیے تو پان گلوری اور لکھنؤ والے اصغر علی محمد علی کے عطر کے عوض پانگ شو سگریٹ اور فرانس کا لونڈر یا سینٹ ملتا ہے۔ حالانکہ اللہ بخشے

بڑے مولوی صاحب کہا کرتے تھے۔ کہ یہ لونڈر لگا کر مسجد میں جانا
تک مکروہ ہے +

عید کے دن ان لوگوں سے ملاقات کو دوست کم اور ماتحت زیادہ
جاتے ہیں۔ یہ دوستوں سے بہت تکلف سے معانقہ کرتے ہیں۔
بشرطیکہ یہ دوست کسی کالج میں ان کے کلاس فیلو رہے ہوں یا
پھر ان کے برابر عہدہ پہ مامور ہوں ماتحت ملازم بھی آج کے دن
ان کے پاس خلوص قلب سے نہیں جاتے بلکہ ملازمتی خوشامد
کے سلسلے سے ان کے گھر جاتے ہیں + افسر صاحب اندر سے دریافت
فرماتے ہیں۔ کیا نام ہے۔ اگر ملازم نے جا کر نام بتا دیا۔ تو
افسر صاحب نے اس کی تنخواہ پر غور کیا + اگر پندرہ بیس روپیہ
ہوئی تو خادم سے کہلا دیا۔ کہ ابھی سو رہے ہیں۔ کل کلاں کو
تشریف لائیے گا۔ اور جو سو روپیہ تنخواہ کا ماتحت ہوا تو بڑی شان
سے باہر تشریف لائے اور عید کا معانقہ فرما کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ مگر
خموش + اب اگر ماتحت ہی نے کچھ عرض کیا۔ تو جی ہاں۔ ٹھیک
ہے۔ درست وغیرہ کہہ دیا۔ ورنہ اخبار "یا ٹیبل" میز پر سے اٹھا کر
دیکھنے لگے اور تھوڑی ہی دیر میں فرمایا:۔

"میں معافی چاہتا ہوں ذرا کام کر رہا ہوں" +

یہ کہا اور اندر چل دیئے + ماتحت صاحب نے میز پہ رکھا ہوا
سگریٹ خود ہی اٹھا لیا اور پیتے ہوئے گھر واپس آ گئے +

غریبوں کی عید

انسانی خلوص - محبّت - مساوات - رسم و راہ اور احکام اسلامی کی تعمیل و تعظیم اگر ہے - تو ان غریب مسلمانوں میں + ان کے ہاں عید کیا آتی ہے - مصیبت ہی آجاتی ہے + مہاجن کا قرض ہو جائے یا گھر نیلام ہو جائے - مگر جب تک بیوی بچّوں اور خود اپنے دولت کے کپڑے حیثیت سے بھی زیادہ قیمتی نہ ہوں عید ہی نہیں ہو سکتی - اور یہ سب نتیجہ ہے جمعہ اور عید کے عربی خطبوں کا - ورنہ اگر امام لوگ اُردو میں خطبہ پڑھتے اور ان کنڈہ تراش مسلمانوں کو اسراف کے لئے ایک دن بھی یہ کہہ دیتے کہ "دوزخ میں جھونک دیئے جاؤ گے" تو قیامت تک بھی یہ لوگ قرض دار نہ ہوتے + یہ حضرات خلوص اسلامی کا مجسمہ بن کر عیدگاہ ہی سے معانقہ شروع کر دیتے ہیں - اور اس میں دوستی یا مُلاقات کا کوئی لحاظ نہیں - بلکہ جو مسلمان بھی سامنے آگیا معانقہ کر ڈالا - اور ہاں مصافحہ بھی + ان کے گھر تین دن تک سوئیاں تیار رہتی ہیں - اور حقہ بھی - کیونکہ ان کے ہاں جس کثرت سے دوست آتے ہیں - کسی دوسرے طبقہ میں نہیں جاتے + جو سامنے آگیا - "بھائی صاحب دو چار لقمے" کا اذن ضرور دے دیتے ہیں + ان سے ملاقات کرنے والوں کا تار بہت کم ٹوٹتا ہے - کیونکہ مصیبت یہ ہے - کہ اگر ان سے کوئی معانقہ نہ کرے - تو یہ خود جا کر چمٹ

جاتے ہیں + عید کے بعد ہی سے ان لوگوں کی کمائی کا کافی حصّہ قرض میں وضع ہونے لگتا ہے۔ اور پھر سال بھر میٹھی عید کا کھایا پیا یاد آتا رہتا ہے + بدقسمتی سے انگریزی معاشرت کا اثر اس طبقہ پر بھی اتنا ہو گیا ہے۔ کہ بوٹ جوتا اور ریشمی موزے خریدے بغیر نہیں رہتے۔ ان کی عورتیں عید گاہ ہر حال میں جاتی ہیں۔ اور ان کے بچّوں کے تمام پیسے انگریزی کھلونے خریدنے میں تباہ ہو جاتے ہیں +

ہماری عید

رمضان شریف کے عشرۂ آخری سے وہ بات بات پر ہم سے لڑنا شروع کر دیتی ہیں۔ اور یہ سب کچھ عید کے شاہانہ مصارف کے لئے ہوتا ہے + ہم چاہے کھدر کا تہ بند باندھ کر عید گاہ چلے جائیں۔ مگر ان کے لئے سیاہ پمپ۔ بنارس کی ساڑھی۔ شلوار۔ اور کلائی پر گھڑی کے ساتھ ہی تمام اعضائے رئیسہ کے لئے زیور بھی لاویں۔ تب تو شوہر ورنہ خدمتگار۔ (یہاں اعضائے رئیسہ سے وہ اعضا مراد ہیں جو زیور سے آراستہ کئے جاتے ہیں) اور یہ سب کچھ اس لئے کہ کسی معمولی گھرانے کی توہین نہیں۔ بلکہ ایک رئیس خاندان کی چہیتی بیٹی ہیں اور گرلز سکول کی تعلیم یافتہ بھی۔ اس لئے انگریزی فیشن کی تمام ترکیبوں سے واقف ہیں۔ صرف

شوہر کی فرمانبرداری سے ذرا ناواقف ہیں۔ جو آج کل کوئی اچنبھے کی بات نہیں + ادھر ہمارا یہ حال کہ عید قریب ہوتے ہی بجائے مسرّت کے غم و الم اور حسرت و یاس کا ہجوم اس لئے ہو جاتا ہے۔ کہ دماغ پایا ہے۔ حساس اور بیدار۔ لہذا آج کے دن افلاس کی ہر اذیّت بے چین کر دیتی ہے۔ کبھی بھائیوں کے معمولی لباس کو دیکھ کر جی بھر آتا ہے۔ کبھی اماں بی کے معمولی کپڑے دیکھ کر کلیجہ خون ہو جاتا ہے۔ کبھی بہنوں کے پاس زیور نہ ہونے پر آنسو بہاتے ہیں۔ اور بار بار خیال آتا ہے۔ کہ قضا و قدر کے اس بے تکے پن پر تبصرہ کر ڈالیں کہ ؎

بے ہنر ارجمند و عاقل خوار

مگر پھر بڑے مولوی صاحب کے کفر کے فتویٰ سے ڈر کر چپ تو کیا گھٹ کر رہ جاتے ہیں + ان حالات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ ہمیں عید عید ہی نہیں معلوم ہوتی۔ مگر انہیں گرلز سکول میں اپنے شوہر کے ساتھ قناعت۔ صبر و رضا اور ہمدردی کی تعلیم ہی نہیں دی گئی ہے۔ اس لئے وہ تو بغیر ساڑھی کے نماز ہی نہیں پڑھ سکتیں۔ جب دیکھو یہی کہ۔

"جاتے نہیں بازار؟"

"عید سر پر آ گئی"۔

"ننھے کے پاس ایک چیتھڑا بھی نہیں"۔

Taj Tahir Foundation

"میرے کپڑوں کا بھی کچھ خیال ہے؟"

"اور وہ بالیاں کب لاؤ گے؟"

"تو کیا اسی حال سے مجھے میکے بھیجو گے؟"

"اور یہ محلے کی عورتیں مجھے اس حال میں دیکھ کر تمہیں کیا کہینگی؟"

اتنے میں ہمشیر بولیں۔ کہ بھابی جان آپ تو بھائی جان کو اس طرح سمجھا رہی ہیں۔ گویا وہ خود کچھ جانتے ہی نہیں۔ بس ہمشیر کا اتنا کہنا تھا۔ کہ ان سے چمٹ گئیں۔ لہذا ہم اٹھے اور بلا ہر چبوترے پر جا بیٹھے ٭

یوں گذر جاتی ہے غریبوں کی عید۔ جس کی خبر نہ گورنمنٹ کو ہوتی ہے۔ نہ پولیس کو ٭ دعا ہے کہ خدا مسلمانوں کو مسرت و شادمانی کی ایسی ہزاروں عیدیں دکھائے ٭ آمین

اخبار۔ انقلاب۔ لاہور ۲۳ مارچ ۱۹۲۸ء

رائے

۲۷ء کے انگریزی ماہ نومبر کی خدا جانے کس تاریخ کو حضرت قبلہ مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب عفران مکان کے ہمراہ برادر مکرم ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب ایم۔اے۔پی ایچ۔ڈی پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی ایک بڑی جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ کہ یکایک موصوف کی نظر ہمارے اوپر آپڑی۔ (یہ دور بیٹھنے والے پر نظر جا پڑی کی ضد ہے (آپڑی) ہم نے فوراً ادب سے سلام عرض کیا۔ تو آخاہ فرما کر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے فرمایا۔

"اجی یہ ہیں مُلّا رموزی"

تو ذاکر صاحب بڑے تپاک سے اُٹھے۔ اور ہم سے مصافحہ فرمایا (حالانکہ موقع معانقہ کا تھا) اور یہ بھی فرمایا کہ

"میں تو جرمنی میں بھی آپ کے مضامین سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ آج آپ کی صورت بھی دیکھ لی"

ہم یہ سمجھے کہ اوہو اب تو ہمارے مضامین ڈاکٹر سر محمد اقبال کے پیام مشرق اور مثنوی وغیرہ سے بھی بڑھ گئے۔ اور اُن کی خوبی اور مقبولیت کا اب یہ عالم ہے۔ کہ وہ جرمنی زبان میں بھی ترجمہ ہونے لگے! مگر ڈاکٹر صاحب کے بیان سے یہ حسرت انگیز تردید بھی ہو گئی کہ جرمنی میں مضامین پڑھنے سے قیام جرمنی مراد ہے نہ

کہ زبان جرمنی + ظاہر ہے کہ اس تردید سے ہمارے دل پر ایک ضرب شدید تو پڑی ۔ مگر ہم نے خود کو سنبھال کر فوراً رسالہ "جامعہ" کا تذکرہ شروع کر دیا ۔ اور ڈاکٹر صاحب کو اپنا یہ احسان جتایا کہ

"ہم نے جامعہ کے علیگڑھی دور میں وہ مضامین لکھے ہیں ۔ جو اصطلاح میں ۔ "معرکۃ الآرا" کہلاتے ہیں" ÷

تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "مگر اب تو آپ نے جامعہ کو بھلا ہی دیا" ÷

تو ہم نے بھی فی البدیہہ یہ عرض کیا ۔ "جامعہ تو اب بالکل ہی متین اور علمی رسالہ ہو گیا ہے ۔ اور ہمیں متانت سے اتنی ہی وحشت ہوتی ہے ۔ جتنی ہندوستانی پولیس والوں کو ہڑتالیوں سے" ÷

تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ۔ "آپ اپنے ہی رنگ میں لکھئے" ÷

اس لئے یہ الفاظ اخبار "ریاست دہلی" ان اداریہ کے حالات کی وجہ سے جامعہ میں یہ بدعتی مضمون پیش کرتے ہیں ۔ خدا اسے قبلہ مولانا اسلم جے راج پوری کی نظر سے بچائے ۔ کہ کہا ہے ؎

گر قبول افتد زہے عز و شرف

اس مضمون کا عنوان ہے "رائے" اس سے مراد کوئی رائے بہادر یا رائے سیتا و بلی نہیں ۔ جہاں سر جان سائمن ڈیرے جمائے پڑے ہیں ۔ بلکہ رائے سے مقصود قدرت کا وہ گراں منزلت انعام و عطیہ

ہے۔جس پر انسانی عروج و ترقّی ۔ اصلاح و رہنمائی ۔ امن و سلامتی کا مدار و انحصار ہے ۔ اور اگر یہی چیز برطانوی پارلیمنٹ کو بھی روزی ہوتی تو وہ قیامت تک کمیشن کو ہندوستان نہ بھیجتی ۔ جس کی وجہ سے دن بھر اپنے شہروں کی دکانیں بند رکھی گئیں + ہمیں جہاں تک یاد ہے "رائے" اُس فکری قوت کا نام ہے ۔ جو انسان کو انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے نہایت درجہ صحیح اور مفید مشورہ دیتی ہے ۔ اور جہاں تک علم ہے یہی وہ قوّت ہے جس کے فقدان ۔ کمی ۔ یا غلط روی سے انسان پھر "دواخانہ یونانی دہلی" ہی کا محتاج ہوجاتا ہے ۔ یا پھر اُسے کچھ دن کسولی میں رہنا پڑتا ہے + انفرادی حیثیت سے رائے کی قوّت انسان کے مزاجی اعتدال یا عمدہ تندرستی سے طاقتور ہوتی ہے ۔ اور اجتماعی حیثیت سے افراد ملک کی رائے اسی حالت میں صحیح رہ سکتی ہے ۔ جب وہ کسی جامعۂ قومی کے تابع ہوں یا اُن پر کسی منتظم حکومت کا احتساب ہو + بخلاف اس کے جن لوگوں کی صحت میں اعتدال نہیں اُن سے یہ قوت سلب ہوجاتی ہے ۔ اور اسی سے تلون پیدا ہوتا ہے ۔ اور وہ چند دن بھی کسی ایک رائے پر قابو نہیں پاسکتے + یہی حال ان غلام افراد کی رائے کا ہوتا ہے ۔ جن پر اُن کی قومی حکومت کا احتساب نہیں ہوتا + رائے کی اصابت اور پختگی کا ایک ذریعہ تعلیم و تربیت بھی ہے مگر یہ اپنے ہندوستان کا بی اے یا ایم اے پن نہیں کیونکہ اس سے

تو صرف انگریزی زبان بولنا اور لکھنا آجاتا ہے (یہ ایم۔ اے پن جلاہاپن کے وزن پر ہے) بخلاف اس کے جن لوگوں کو اپنی قومی حکومت حاصل نہیں اُن کی رائے میں اصابت اور پختگی نہیں ہوتی ہر شخص اپنی اینٹوں والی مسجدوں میں نمازیں پڑھنے کا طالب نظر آتا ہے۔ اور ایسی ہی قومیں ہوتی ہیں جو عروج دار تقا اور وحدت وجامعیت کا کبھی منہ نہیں دیکھ پاتیں۔ اور اُن میں ہمیشہ افتراق و بہمی موجود رہتی ہے۔ لیکن تم ترکی جامعۂ قومی یا جامعۂ ایران پر ایک نظر ڈالو۔ جہاں مصطفےٰ کمال پاشا اور شاہ رضا خاں کی ایک آواز پر وہاں کے بڑے بڑے ارباب رائے بغیر کسی اختلاف و تردید کے آمادہ عمل ہو جاتے ہیں + گویا وہ اپنے رہنمائے اعظم کے خلاف اپنی کوئی علیحدہ رائے ہی نہیں رکھتے۔ لیکن ایک اپنا ہندوستان بھی ہے جس کے اندر آج ۳۳ کروڑ افراد کی ۳۳ کروڑ قسم کی رائیں بھی ہیں۔ جہاں ہر شخص مختار ہے کہ جب چاہیگا کانگرس مسلم لیگ۔ جمعیتہ العلماء۔ ہندو مہاسبھا۔ وغیرہ سے کنارہ کشی کرلے یا لیڈروں میں سے کسی کا مخالف ہو جائے گا پس اس اختلاف رائے کے اسباب یہ ہیں۔

(۱) کوئی قومی احتساب و سزا نہیں۔ جس کے خوف سے افراد کی رائے ایک متحدہ مرکز عمل کی تابع رہ سکے +

(۲) صحیح تعلیم و تربیت نہیں۔ جو ان کو ایک متحدہ مرکز کے

تابع بنائے رہے +

(۳) قوم کے سامنے خود لیڈروں کا کوئی متفقہ مقصد نہیں۔ گویا خود لیڈروں کی بھی کوئی رائے نہیں +

(۴) قوم کی صحت یقیناً معتدل نہیں۔ اور اُس میں امراض یا آلام کو کثرت سے دخل ہے۔ جس کے اثر سے اُن کے دماغ معطل نہیں تو متاثر ضرور ہیں +

(۵) جن لوگوں کی صحت اچھی ہے۔ جو تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ اور صحیح رائے قائم کرنے کے اہل بھی ہیں۔ اُن پر کوئی سزا یا احتساب عائد نہیں۔ لہذا اُن کی رائے بھی صحت کے اعتبار سے ناقص اور بعض مواقع پر غلط ہو سکتی ہے۔ جیسے ہندوستانی لیڈر جن کے اعمال پر کوئی گرفت و پرسش نہیں بخلاف اس کے مغربی ممالک میں ایسے آزاد رائے رکھنے والے لیڈر ہلاک کر دیئے گئے ہیں۔ جنہوں نے اظہار رائے میں غلطی کی۔ لیکن ہندوستان میں مذکورہ غلطیاں یا کمزوریاں موجود ہیں +

نپولین بوناپارٹ کے متعلق ایک نہایت پرانے مولوی صاحب نے کہا تھا۔ کہ جب وہ کسی رائے کو ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ تو ایک کھلے میدان میں اکڑ کر کھڑا ہو جاتا تھا + پھر دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر گردن کو سینہ کی طرف جھکاتا تھا۔ اور کئی گھنٹہ سوچا کرتا تھا + پھر جو رائے وہ اس غور کے بعد قائم کر لیتا تھا۔

اُس پر شدّت سے عمل کرتا تھا + لیکن دنیائے انسانیت کے مصلح
اعظم حضور اقدس و اعلیٰ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے
بتلایا تھا۔ کہ تم اپنی قائم کی ہوئی رائے پر دوسرے ذی شعور لوگوں
سے رائے لے لو۔ تاکہ اُس کی پختگی پر تمہیں کامل اعتماد ہو جائے۔
اور اسی کو اصطلاح میں مشورہ کہا گیا تھا۔ اور حضور اقدس علیہ السلام
کے اس حکمت فروز کلمہ ہی سے اس امر کا بھی اندازہ ہو سکتا
ہے۔ کہ "رائے" کس درجہ ذمہ دارانہ یا اہم قوت کا نام ہے جس
کے لئے اس قدر اہتمام کی ضرورت ہے + لیکن ہندوستان میں
یہ کچھ بھی نہیں۔ بلکہ یہاں کا کم سن۔ کم علم اور نادان طالبعلم
بھی کانگریس اور جمعیتہ علماء کے اعمال و احکام پر رائے دے
سکتا ہے۔ اور اس سے وہ اپنے ساتھیوں کو بھی متاثر کرتا ہے +
بس اخبار کا پڑھ لینا آگیا کہ رائے کی تمام ذمہ داریاں گویا
آئینہ ہو گئیں + اور حق یہ ہے۔ کہ اجتماعی حیثیت سے یہی
فکری آزادی یا آزادیٔ رائے ہے جو ہندوستان کی ہر
اجتماعی تحریک کی بربادی کا سبب بنی ہوئی ہے + اب ذیل
میں ایسے آزاد رائے طبقات کے چند نمونے ملاحظہ فرمایئے +

علمائے کرام

مسلمانوں کے اعتقادی نقطۂ نظر سے یہی
وہ مقدس و محترم طائفہ ہے۔ جس کی رائے پر مسلمانوں کی
جملہ تحریکات کا مدار ہے۔ اور اسی طرح از روئے ضوابط

اسلامی یہی وہ طبقہ ہے جس پر مسلمانوں کی زندگی کا انحصار ہے لیکن مجھے جرأت سے کہنے دیجئے کہ اس محترم طبقہ میں رائے کی ذمہ داری کی کوئی قیمت ہی نہیں۔ گو ایسے بھی قابل احترام علماء موجود ہیں جو رائے کی ذمہ داری کو بہ طریق احسن محسوس فرماتے ہیں لیکن ایسے بیدار مغز علماء کرام کی تعداد کم ہے اسکا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی متعدد جماعتیں ہیں جو ایسے علماء کرام کے تابع غیر اصول بلکہ تباہ کن زندگی میں مبتلا ہیں۔ جو اپنی رائے کی ذمہ داری کو محسوس نہیں فرماتے۔ اور جو اجتماعی اور انفرادی رائے کے فرق اور اثر سے بے خبر تو کیا بے پرواہیں۔ جہاں کوئی اجتماعی تحریک رونما ہوئی اور علمائے کرام میں اظہار رائے کا مجادلہ شروع ہو گیا۔ جس نے جو چاہا کہہ دیا۔ ہاں علی گڑھ اسلامیہ کالج پشاور۔ اسلامیہ کالج لاہور کے مسلمان طلبہ کے لئے جس قسم کی رائے چاہے دے دی جائے۔ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ علمائے کرام اپنی رائے اُن مسائل کے خلاف بھی ظاہر فرماتے ہیں۔ جو مجلس مرکزی یعنی جمعیتہ عالیہ علماء ہند کی متفقہ رائے ہوتی ہے۔ اور علماء محترم کا ایسا آزادانہ اختلاف بھی حقیقت میں کسی قومی یا ریاستی احتساب کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ اور ہندوستان میں تو اختلاف رائے نے عقائد تک متاثر کر کے جماعتیں بھی پیدا کر دی ہیں۔ جو اکثر ان نیچری لیڈروں کے جلسوں میں لٹھ لیکر گھس جاتی ہیں۔ جن کے مظاہرے

سلطان ابن سعود کی مخالفت میں کثرت سے دیکھے گئے ٭

لیڈروں کی رائے

جب سے مسلمانوں نے علوم دین کی تحصیل و تعلیم بغیر انگریزی تعلیم پر اکتفا کر لیا۔ اس وقت سے یہ قابل نفرت اور نقصان رساں خیال مسلمانوں میں جڑ پکڑ گیا۔ کہ دین اور سیاست دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ اور یہ سمجھ لینے کا سبب بھی اسلامی حکومت کا فقدان تھا + گو یہ خیال ابھی ہندوستان میں جرأت سے ظاہر نہیں کیا جاتا۔ لیکن غیر دینی تعلیم نے اس خیال کو راسخ ضرور کر دیا ہے۔ اور یہ غیر محسوس رفتار سے پوری سرعت سے ترقی کر رہا ہے۔ اور بعض معاملات میں عملی صورت بھی اختیار کر چکا ہے۔ ورنہ علماء کرام کے بعد لیڈر کوئی دوسری چیز نہیں تھے۔ لیکن بے دینی کا اثر ہے کہ آج علمائے کرام اور لیڈر دو علیحدہ علیحدہ چیزیں سمجھی جاتی ہیں۔ حالانکہ شرعی اور اخلاقی اعتبار سے دونوں کی ذمہ واری ایک ہی ہے۔ اور اسے جس درجہ مضبوط اور صائب ہونا چاہئے۔ وہ ظاہر ہے۔ اور یہ صرف اجتماعی حیثیت سے تو آج تمام ہندوستانیوں کو حق حاصل ہے کہ وہ کہہ دیں کہ صبح سویرے بغیر انگریزی چائے پینے کو ڈکار لینا بھی حرام ہے۔ یا ہم کہہ دیں کہ ہندوستانیوں کا موجودہ کثرت کے ساتھ چائے پینا بھی مغربی لوگوں کی تمدنی یا معاشرتی غلامی ہے + پس اجتماعی حیثیت سے ملک کے موجودہ لیڈروں کی

رائے آج جس درجہ ارزاں اور اختلاف افزا ہوا کرتی ہے - ظاہر ہے +
ان حضرات میں اختلاف رائے کی بڑی وجہ یہی ہو سکتی ہے - کہ وہ
اپنے مقابل کی ارتفاع کو برداشت نہیں کر سکتے - اور اسی سے
اُن کے مزاج یا صحت کے غیر معتدل ہونے کا علم ہو سکتا ہے +
یقین نہ ہو تو قبلہ مکرم حکیم محمد احمد صاحب کو نبض دکھا کر معلوم
کر لیجئے + اسی طرح اظہار رائے میں جو عجلت اس طبقہ کی طرف
سے ظاہر ہوتی ہے - وہ بھی لیڈری کی ذمہ داری کے منافی ہے +
پھر بڑی مصیبت یہ ہے کہ عوام میں ذہنی استعداد نہ ہونے کے
باعث اس اختلاف رائے کو بھی اُسی طرح قبول و اختیار کیا جاتا
ہے - جس طرح علماء کرام کی جماعتوں میں دکھایا گیا ہے - اور یہ
لیڈروں کے اختلاف رائے ہی کا نتیجہ ہے کہ آج ملک میں بے
شمار انجمنیں اور کانفرنسیں نظر آتی ہیں - جو کسی صحیح مرکز سے
وابستہ نہیں + ورنہ اصولاً ہونا یوں چاہیئے تھا کہ مسلمانوں کی تمام
جماعتیں جمعیتہ علماء سے وابستہ ہوتیں - کہ ہر اعتبار سے یہی
مجلس مسلمانوں کے تمام مسائل کی ذمہ دار ہو سکتی ہے - اور
مجلس خلافت - مجلس تبلیغ - اور مسلم لیگ اس کی شاخیں سمجھی
جاتیں + اسی طرح ہندو بھائیوں کے ہاں "ہندو سبھا" کو مجلس
اعلےٰ بنایا جاتا اور اس کا اقتدار شدھی سبھا - آریہ سبھا - ہندو آدی
سبھا اور گئو رکھشا وغیرہ پر ہوتا + لیکن ایسا جو نہیں ہو رہا ہے

وہ اسی لئے کہ لیڈروں کی رائے پر بھی کوئی احتساب و سزا نہیں +
یہ ہر جگہ لفظ سزا کے معنی آپ بعبور دریائے شور والی سزا نہ سمجھ لیجئے
بلکہ اس سے مقصد اعمال کی پرسش یا گرفت
ہے۔ یا خوف پرسش مثلاً یہ جو انگریزوں کے خلاف
باغیانہ مضامین لکھنے میں ہم انتہائی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔
سو اسی لئے کہ کہیں ذرا سی غلطی پر کوتوال صاحب ہم سے ملاقات
کو نہ آجائیں۔ یا لالہ لاجپت رائے کوئی باغیانہ کتاب لکھنے میں
جو تامل کرتے ہیں۔ سو اسی لئے کہ کہیں جلاوطنی کا معاملہ پھر نہ شروع
ہو جائے + لیکن انگریزوں سے بے خوفی اور عدم پرسش کی آزادی
دیکھنا ہو۔ تو اپنے مولانا محمد علی و شوکت علی مدفیوضہما کو دیکھ لیجئے۔
کہ جو انگریزوں کے خلاف یہی لکھتے رہتے ہیں کہ

"ورنا برحق نہیں مرنا برحق ہے"

غرض لیڈروں کی رائے کی ذمہ داری خود لیڈروں کے ذہن
میں نہیں۔ اور اسی لئے ملک بے شمار جماعتوں پر تقسیم ہو چکا
ہے

ایڈیٹروں کی رائے + علمائے کرام اور لیڈروں کے بعد
ایڈیٹروں کی جماعت ہے۔ جس کی رائے اجتماعی حیثیت
سے بے حد عظمت و اثر کی مالک ہے۔ ورنہ انفرادی حیثیت
سے تو اپنے پیسہ اخبار کے ایڈیٹر صاحب بھی زندہ ہیں + پس اس

جماعت کی رائے میں بھی بے حد اصابت۔ وحدت۔ اتباع اور سنجیدگی کی ضرورت تھی + لیکن اس جماعت میں تعلیم و تربیت کے نقائص زیادہ کارفرما ہیں۔ اور کوئی ایڈیٹر نہیں جو کبھی دوسرے اخبار کی پختہ اور صحیح رائے کی اتباع کو پسند کرتا ہو۔ اور اس لئے اسلامی جرائد کے سامنے کوئی متفقہ مقصد نہیں۔ بلکہ الٹی ترکیب یہ اختیار کرلی ہے کہ بجائے رہنمائی کے عوام کے ذوق کی پیروی کرتے ہیں اور جو کبھی اظہار رائے کا موقع آجائے تو پھر اس کثرت سے رائیں شائع ہوتی ہیں کہ اُن سے "باہتمام مولوی مقتدیٰ خاں شروانی" ہزاروں کتابیں شائع کرسکتے ہیں + اسی طرح اظہار رائے میں انتہائی عجلت سے کام لیا جاتا ہے۔ گویا اخبار کا مقصد ہی یہ ہوا۔ کہ اگر وہ روزانہ ہے تو روزانہ ایک نئی رائے کی اشاعت بھی اخباری فرض ہے۔ اور یہ اسی بے اصول رائے زنی کا اثر ہے۔ کہ ناظرین اخبارات میں بھی کسی اجتماعی رائے کی اتباع کی صلاحیت نہیں۔ بلکہ خود ناظرین اخبارات میں بھی اہل الرائے ہونا ہر خریدار کے لئے ضروری چیز ہوگیا ہے۔ اور یہ طے شدہ معاملہ ہے۔ کہ اخبار کا ہر مضمون پڑھ کر اس پر اظہار رائے بھی کیا جائے۔ جیسا کہ جنگ یورپ میں جرمنی فتوحات پر ناظرین اخبارات میں اظہار رائے ہوا کرتا تھا + اور یہ اخبار میں طبقہ ہی کی رائے تھی کہ جرمنی مصر کو فتح کر چکا۔ اور قیصر جرمنی جمعۃ الوداع کی نماز جامع مسجد

دہلی میں پڑھے گا۔ کیونکہ وہ مسلمان ہو چکا ہے + اس وقت ہم نے بھی رائے دی تھی کہ دیکھنا قیصر جرمنی مسلمان ہونے کے بعد اگر مرید ہوگا تو اپنے خواجہ حسن نظامی کا۔ ورنہ وہ بے پیرا ہی پھرتا رہیگا + اس بے راہ روی اور فکری آزادی کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ خود اخبار نویسوں اور اخبار بین حضرات کی رائے میں وحدت نہیں۔ اور یہ بھی نتیجہ ہے عدم احتساب کا +

ہماری رائے اس معاملہ میں جہاں تک تجربہ ہوا بس ایک ہم بہت محتاط انسان ہیں + قوم تو قوم انفرادی حیثیت سے بھی ہم کبھی اپنی رائے ظاہر نہیں کرتے۔ اور اس کے "جملہ حقوق بحق جمعیۃ العلما" محفوظ رکھتے ہیں + اس کا بڑا فائدہ تو یہی دیکھا۔ کہ آج تک ہم قوم کی نظر میں "بیوقوف قرار نہ پائے" + اور دوسرا فائدہ یہ ہوا۔ کہ خدا کے بے گناہ بندے ہماری رائے کی غلطی سے محفوظ رہے۔ مگر وہ جو فارسی زبان میں کہا ہے ؎

خدا تیغ انگشت یکساں نہ کرد

سو ہمارے دوستوں میں ایک دوست مولوی سید محمد عسکری وکیل مصطفےٰ آبادی بھی ہیں۔ جو علاوہ ایک بے مثل قانون داں ہونے کے "اہل الرائے" بھی ہیں + وکیل صاحب آج کل ریاست بھوپال میں وکالت کرنے تشریف لے گئے ہیں۔ مگر ایک زمانہ تھا جب آپ کو علامہ شبلی اور اکبر الہ آبادی کے قریب تر بیٹھنے

کا فخر حاصل تھا - اور ممدوحین مغفور کی یہ انہی علمی و ادبی - تاریخی
و معاشرتی صحبتوں کا ماہوار اثر ہے - کہ وکیل صاحب موصوف کو
ہم سے اُس وقت سے محبّت ہے جب ہمارے افلاس کی وجہ سے
امیر آدمی ہماری عزّت ذرا کم کیا کرتے تھے + مگر وکیل صاحب
اُس وقت بھی ہمارے پاس یہ کہہ کر تشریف لاتے تھے - کہ

"ملا صاحب! جس طرح ارباب ذوق و اصحاب علم و فضل علامہ
شبلی اور اکبر کی خدمت میں کسب فیض کے لئے جاتے تھے - میں
بھی اسی حیثیّت سے آپ کے پاس حاضر ہوتا ہوں +

وکیل صاحب کے اس خیال میں ایک بات اُن کے فائدے
کی بھی تھی - یعنی وہ خود کو پہلے ہی سے ارباب ذوق و اصحاب علم و
فضل کے ہم پایہ سمجھ کر ہمارے پاس آتے تھے + وکیل صاحب
کا دوسرا خیال یہ بھی ہے کہ میں علاوہ قانون دانی کے مذہب اور
سیاست دانی میں بھی فرد ہوں - گویا گاماں پہلوان سے لڑنے
والے زبسکو ہی ہیں - جو وکیل تھا اور پہلوان بھی + غرض وکیل
صاحب کی ملاقات کا خلاصہ یہ ہوا کرتا تھا - کہ ہر بات کے شروع
میں وہ فرماتے تھے - کہ

"مگر میری رائے میں تو کانگریس کا وجود ہی بیکار ہے"

تو ادھر ہر بات کے خاتمے پر فرماتے تھے کہ

"جی ہاں - مگر میری رائے میں بھی یہ اسلامیہ کالج قوم کی

ذہنی حالت کو تباہ کرنے والے ہیں - اور میری رائے میں اخلاق
و مذہب تو ان کا لجوں کے لئے پیدا ہی نہیں ہوئے "
غرض لفظ "میری رائے میں" کا ہم دونوں اس کثرت سے
استعمال کرتے تھے - کہ ایک دوسرے کو فضیلت اور فتح کا موقع
ہی نصیب نہ ہوتا تھا - مگر آخر میں وکیل صاحب نے ایک
بصیرت فروز نکتہ یہ بتلایا - کہ
"ملا صاحب! یہ جو کچھ اظہار رائے ہوتا ہے - اسے صرف
"خانگی" ہی رہنے دیجئے "
پہلے تو ہم نے کسی قدر غصہ سے اس "خانگی" پر غور کیا -
مگر فوراً ہی سمجھ گئے کہ وکیل صاحب کا مقصد یہ ہے - کہ ہر
شخص پر فرض ہے کہ وہ اپنی رائے کو صرف ایک ذاتی خیال
سمجھے اور قومی و ملکی مسائل میں ہمیشہ اپنے لیڈروں اور اپنی
ملکی و قومی مجالس کی رائے کو قابل اتباع سمجھے تاکہ قوم کے
متفقہ اور اجتماعی مسائل میں افتراق و برہمی نہ پیدا ہو + مگر
یہ تو ہوا اس لئے کہ ہم دونوں قابل ترین انسان تھے لیکن ان
باقی ۳۲ کروڑ ہندوستانیوں کا کیا بندوبست ہوگا - جو ہر
ایک اپنی ذاتی رائے کے موافق اجتماعی مسائل میں رخنہ
انداز ہوتا ہے؟ ترکیب یہ ہے کہ جب تک سو راج نہ ملے
اُس وقت تک قوم کے متفقہ فیصلہ کو اپنی تنہا رائے سے

ٹھکرا دینے والوں کا مقاطعہ عرف "بائیکاٹ" کیا جائے۔ جس کے خوف سے وہ کسی متفقہ فیصلہ کے خلاف اپنی رائے ظاہر نہ کر سکیں۔ اور جب سوراج مل جائے تو پھر ایسے لوگوں کے لئے وہی وارنٹ گرفتاری۔ حوالات۔ گالیاں۔ چانٹے۔ گھونسہ بید۔ چالان۔ قید بامشقت بے نمک مرچ کا سالن۔ پھر بعبور دریائے شور اور آخر میں گلے میں باریک سا پھندا ؛

خدا ان سزاؤں سے ہمیں اور بڑے مولوی صاحب کو بچائے۔ آمین۔ ضرورت ہے کہ قوم و ملک کے متفقہ فیصلوں پر پورے غور و احتیاط سے اظہار رائے کیا جائے اور بہتر یہ ہے کہ اتباع کی کوشش کی جائے ؛

(رسالہ جامعہ دہلی فروری ۱۹۲۸ء)

Taj Tahir Foundation

اُنیسویں صدی کا خدمتگار

یہ تو اب بڑھاپے کی وجہ سے ہندوستان کے "کالا آدمی" سے ہم بہت کم ملتے ہیں۔ ورنہ ایک وہ وقت بھی تھا جب ہر نیا وائسرائے ہندوستان کا چارج لیتے ہی سب سے پہلے ہم سے ملاقات کرتا تھا۔ اور ہم پوری وفاداری سے اپنے ہندوستانی بھائیوں پر انگریزی قبضہ مضبوط کرنے کے لئے بعض مشہور غدار لیڈروں کی طرح یہاں کی تمام کمزوریوں اور راز کی باتوں کو اس سے کہہ دیا کرتے تھے اور وائسرائے اس کے شکریہ میں ایک آدھ گاؤں۔ ایک آدھ خطاب۔ ایک آدھ عہدہ دے کر ہم سے "تھینک یو" کہتا تھا۔ اور لاٹ صاحبوں کی یہ اسی ہم نشینی اور مصاحبت کا اثر ہے کہ جناب آج بھی جس امیر جس رئیس۔ جس وثیقہ دار۔ جس تعلقہ دار اور جس راجہ غرض جس قسم کے "کالا آدمی" کے پاس چلے جاتے ہیں وہ بے پردہ کرائے ہمیں اپنے گھر کے اندر بلا لیتا ہے۔ کیونکہ سوائے پنڈت مدن موہن مالوی کے تمام لوگ جانتے ہیں کہ ہم انگریزوں کے خاص الخاص ہیں اور ہمارے ایک ہی اشارے پر قادیان دارالامان سے لے کر مرکزی خلافت کمیٹی تک پر گورنمنٹ پہرہ

بٹھاویگی ؛

پس بڑے بڑے لوگوں کی اس ملاقات اور راہ و رسم سے ہمیں آج کل کے خدمتگاروں کے جو عبرت آموز تجربے حاصل ہوئے ہیں وہ آپ کے لئے ارسال خدمت ہیں۔ چنانچہ ایک وہ وقت بھی تھا جب سرکار معلّٰے حضور عمر فاروق رضؓ خلیفۂ اسلام ایسا عظیم القدر بادشاہ اپنے خدمتگار کو اونٹ پر بٹھا کر اس کی مہار پکڑے بیت المقدس میں داخل ہوا تھا اور خدمتگار کے ساتھ اس مساوات و نوازش کا سبب یہ تھا کہ اس زمانے کے خدمتگار زہد و پاک دامنی۔ امانت و خداپرستی میں آج کل کے فتویٰ نگار سرکاری علمائے کرام سے کہیں اشرف و اعلےٰ ہوا کرتے تھے۔ لیکن آج کل جس قسم کے خدمتگار مسلمانوں کے محلوں۔ کوٹھیوں۔ بنگلوں۔ عدالتوں اور گھروں میں ملتے ہیں۔ ان کے چند نمونے یہ ہیں :۔

درجہ اوّل خدمتگار | وائسرائے ہند کا ہوتا ہے۔ اس کی تعریف صرف اسی قدر ہے کہ یہ علاقہ پنجاب کا کوئی نمازی۔ پرہیزگار مسلمان ہوتا ہے۔ اس کی زبان سے وائسرائے ناواقف اور یہ وائسرائے کی بولی سے گھبراتا ہے۔ اس کی ڈاڑھی خاصی سفید ہوتی ہے اور یہ سرخ بانات کی شیروانی پر طلائی پیٹی باندھتا ہے۔ اس کا کام صرف وائسرائے کے حق میں دعائے خیر کرنا اور اپنے پیٹ کی خیر منانا ہوتا ہے اور بس۔

درجہ دوم خدمتگار رئیسوں کا ہوتا ہے اس کے کارنامے نہ بیان کرنا ہی مناسب ہے۔ اس کی جامع تعریف یہ ہے کہ اصل میں یہ خود رئیس ہوتا ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو چاہتا ہے کرا لیتا ہے۔ اس کو خوش رکھنے کے لئے حکومت کے وزراء۔ علماء۔ حکماء اور فقہاء تک نماز قضا کر دیتے ہیں مگر یہ پھر بھی کسی سے خوش نہیں رہتا اور آخر وقت تک رئیس سے سلام کرنے کا موقع نہیں دیتا کبھی کہتا ہے حضور چائے پی رہے ہیں۔ کبھی کہتا ہے حضور حجامت بنا رہے ہیں۔ کبھی کہتا ہے حضور آرام میں ہیں۔ کبھی کہتا ہے حضور شکار کی تیاری فرما رہے ہیں۔ غرض ہر طرح عصر کی نماز کا وقت تنگ کر دیتا ہے۔ سُنا ہے کہ حشر میں ایسا خدمتگار صرف ورادوزخ میں جھونک دیا جائیگا +

درجہ سوم خدمتگار ہندوستانی جج یعنی "ہائیکورٹ" کا ہوتا ہے یہ دن بھر عدالت کے دروازے پر نہایت غرور سے کھڑا رہتا ہے تمام ماتحت جج۔ مدعی۔ مدعا علیہم اور وکلاء جب اندر جانا چاہتے ہیں۔ یہ کہہ دیتا ہے کہ صاحب فیصلہ لکھ رہے ہیں"۔ یہ صرف جج صاحب کے لئے رشوتیں فراہم کرتا ہے۔ چہرے پر نہایت مولویانہ انکسار نمایاں رہتا ہے +

درجہ چہارم خدمتگار خانقاہ والے فقیروں اور صوفیوں کا ہوتا ہے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ یہ ہر نئے مرید کو پیر صاحب کے من

گھڑت معجزے اور کرامات سناتا رہے۔ اس کا ٹھکانا دنیا ہی میں جہنم ہوتا ہے۔ مثلاً وہ پیر صاحب کی ملازمت کی وجہ سے چار و ناچار آدھی رات لمبے لمبے وظیفے پڑھتا ہے۔ مریدوں کے سامنے دن بھر تسبیح بجاتا ہے تاکہ لوگ اسے کہیں کا بڑا ہی عابد حسین و ذاکر حسین اینڈ کو سمجھیں ٭

درجہ پنجم گھر کا خدمتگار ہوتا ہے اور یہی وہ خطرناک خدمتگار ہے جس کی داستان ملحوظ بیان رہے آجکل جن مالدار مسلمانوں کے گھروں پر خدمتگار ہوتے ہیں وہ عموماً ان کے گھر کے "پروردہ" بچے ہوتے ہیں جو جوان ہو کر ستم ڈھاتے ہیں۔ مسلمان کا مالدار ہونا علامت ہے اس کی غفلت۔ عیش پسندی۔ عیاشی اور آرام طلبی کی اور آج کل کے "پروردہ نوجوان خدمتگار" ہر کوتوالی کے رجسٹر میں جاہل مکار۔ بدکردار۔ چور اور دغاباز لکھے ہوئے ہیں۔ نہ ان میں آقا کے حقوق۔ اس کے نمک اور مرچ سمجھنے کی اہلیت ہوتی اور نہ یہ خدمتگار۔ خدا پرست متقی۔ پارسا اور تعلیم یافتہ ہوتے بس یہ تو بہ کرتے ہیں کہ آقا صاحب کو ہر وقت خوش رکھ کر ان کے پورے خاندان کے اسی طرح مالک بن جاتے ہیں۔ جس طرح بادشاہ ایران کے پیرس میں عیش فرمانے کے زمانے میں رضا خاں پہلوی نے کر دکھایا۔ اور آج بادشاہ ایران اپنے دارالحکومت کا فاتحہ پڑھنے تک سے محروم ہو چکے ٭

گوہاٹی کانگریس کی سبجکٹ کمیٹی میں ہمیں تقریر کرتے دیکھا۔ تو بہت خوش ہوئے اور شام کو ہمارے کیمپ پر آئے۔ کچھ دن پہلے "گورنمنٹ پسند" تھے مگر اب "سورلج پسند" ہو گئے ہیں۔ لیکن کوئی اعتدال پسند یا انتہا پسند نہیں بلکہ "ابتدا پسند ہیں" صوبہ متحدہ کے وسیع و عریض صوبے میں ایک طرف کے ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ ایک میدان میں بہت ڈرتے ڈرتے آملے کہنے لگے۔

"مولانا رات کو آپ کی تقریر نے مجھے آپ کا گرویدہ بنا دیا۔ پہلے بھی گلابی اردو اخبارات میں پڑھ کر لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ یہاں سے فارغ ہو کر آپ میرے غریب خانہ کو شرف مہمانی عطا فرمائیں؟ چونکہ یہ "ملا"۔ "مولوی" اور "حافظ جی" قسم کے لوگ۔ مہمانی دعوت اور تحفے کو مذہبی سعادت سمجھ کر کبھی ٹالا نہیں کرتے۔ اس لئے مذبذبا مہمانی قبول کر کے ان کے ساتھ ہو گئے۔ وطن پہنچے۔ تو دیکھا کہ "جد امجد کی شاندار کوٹھی"۔ موجود ہے جس کے اندر علی گڑھ کی تعلیم کی رو سے باتھ روم۔ بیڈ روم۔ ڈرائنگ روم۔ ڈریسنگ روم اور باغ میں "بجیرہ روم" تک بنا ہوا ہے۔ جس میں گھر کے لوگ نہاتے تھے۔ اسی کے ایک کمرے میں ہماری مہمانی والا معاملہ ہونے والا تھا۔ یہ کمرہ بھی سائنس کے بالکل موافق آراستہ تھا۔ جس میں مہمان کے لئے بجائے مصلے۔ تسبیح۔ مسواک اور

حمائل شریف کے میڈالن انگلینڈ سیفٹی ریزر بلجیم کی ایک روپیہ چودہ آنے والی سفید سلی۔ فرانس کی قینچی۔ آئینہ۔ کنگی۔ پوڈر۔ تولیا۔ پری جمال صابون۔ بال صفا پوڈر۔ اور خضاب لاجواب کے ڈبے کچھ اس قرینے اور سلیقے سے رکھے تھے کہ ہمیں "ہمدرد دواخانہ یونانی دہلی" کا دھوکہ ہوا۔ ایک خاندانی اور نخالص ہندوستانی ڈپٹی کلکٹر کے "غریب خانے" میں انگلستانی لوگوں کے برتنے اور استعمال کرنے کے یہ تمام برتن دیکھ کر ہمیں تو غصہ آیا ان انگریزوں پر جواب بھی کہے جاتے ہیں کہ :-

"ہندوستانی ابھی حکومت کرنے کے قابل نہیں"

ڈپٹی صاحب کی اس انگلستانی کوٹھی کے اس "شان دار وائٹ ہوس" میں داخلے کے وقت سامنے والے آئینے میں ہمیں اپنا حلیہ یوں نظر آیا کہ فرقان مبارک پر کھدر کا نصف تھان بغل میں خواجہ حسن نظامی صاحب کا قرآن آسان قاعدہ۔ ہاتھ میں انگریزی بھینس کی لاٹھی۔ ڈاڑھی بقدر شرع شریف۔ نصف پنڈلی تک کا دیوبندی چار جامہ عرف پاجامہ۔ پاؤں میں بقدر ڈھائی سیر وزنی دیسی جوتا۔ مگر ڈپٹی صاحب کا تخیل دیکھئے۔ کہ انہوں نے اس علی گڑھی کوٹھی میں ہمارے اس "دیوبندی فل ڈریس" پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہم اس کوٹھی کے قیمتی قالینوں پر جوتا پہنے ٹہلتے رہے۔ اور چہرے پر

کوئی گھبراہٹ پیدا نہ ہوئی تو ڈپٹی صاحب سمجھ گئے کہ ملّا صاحب بھی اس کوٹھی کی جدید تہذیب سے واقف ہیں کچھ کچھ - اور انگریزی معاشرت اور ایٹی کیٹ کو جانتے ہیں کچھ کچھ - بہر حال ڈپٹی صاحب نے فرمایا کہ :-

"اسی کمرے میں آرام فرمائیے اور دیکھئے مولانا میرے کچہری کے اوقات میں کوئی تکلیف نہ اوٹھائیے گا - غفورا آپ کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہیگا"

جان لیجئے اور خبردار ہو جائیے کہ غفورا ڈپٹی صاحب کا اسی قسم کا پروردہ - نمک حلال اور وفادار خدمتگار ہے جس کی علامتیں اوپر بیان ہو چکی ہیں - پس اس غفورا پر ڈپٹی صاحب کو اتنا ہی بھروسا تھا جتنا وائسرائے کو مالوی جی اور لاجپت رائے صاحب پر اور یہ تمام بھروسہ محض اس لئے کہ غفورا ڈپٹی صاحب کی عیّاشی میں خاصا معاون اور پاؤں دبا کر گھر بار کے حالات سے بے خبر کر دینے میں طاق تھا - ڈپٹی صاحب کچہری سے آئے کہ غفورا موٹر پر پہنچ گئے - آفس بکس لیا - مفلر اٹھا لیا - ہیٹ سنبھال لی اور پانیئر اخبار بھی اٹھا لیا - پھر پوری سرعت سے اس سامان کو مقامات مقدسہ تک پہنچا کر ڈپٹی صاحب کی کرسی پر آگیا اور اپنے ہاتھ کے رومال سے ڈپٹی صاحب کا جوتا صاف

کیا۔ جوتا کھولا۔ اُتارا۔ رکھا اور جھٹ نیا پانیر اخبار لاکر ہاتھ میں
دیدیا تو ڈپٹی صاحب لیٹ گئے کرسی پر واسطے دیکھنے اخبار کے
اور غفورا بیٹھ گئے واسطے دبانے پاؤں کے۔ اس وقت قدرتاً
ڈپٹی صاحب کا دماغ کچہری کے دن بھر۔ مدعی حاضر ہے؟۔
حسب دفعہ فلاں اور تعزیرات فلاں کی رو سے ویسا ہی معطل تھا۔
اب جو تازہ پانیر آلہ آباد ملا تو ڈپٹی صاحب دنیا و مافیہا سے
بھی گئے گزرے۔ اب ہیں خاص محویت کے عالم میں اللہ دے اور غفورا
لے۔ غفورا نے جو دیکھا کہ ڈپٹی صاحب غفلت رکاہلی اور اعتماد
کی وجہ سے کبھی غفورا کی بات کی تحقیق ہی نہ کرتے تھے۔ لہذا
غفورا نے فوراً نہایت بیمار لہجے میں کہا:۔

ہُوں۔ آج چھوٹی بیا نے پانچ مرتبہ بازار
سے پان منگائے جو کہا کہ اتنے پان کیا
کروگی تو ہزاروں گالیاں دیں اور مارنے
کو دوڑیں"۔

ڈپٹی صاحب کے حقیقت ناشناس کانوں میں غفورا کی جو یہ
آواز پہنچی تو جھنا کر اخبار پھینک دیا اور فرمایا مگر کس قدر معقول
فرمایا:۔

"ہاں گالیاں بھی دیں؟ اچھا چھوٹی بیا کے آج سے
پان بند"

لیجئے وہاں چھوٹی بیا کو ان معاملات کی خبر تک نہیں لیکن یہاں غفورا نے اپنا الّو سیدھا کر لیا اور موقع پاتے ہی فوراً پہنچے زنان خانے کے دروازے پر چھوٹی بیا چہاردہ سالہ معصوم سن کے اعتبار سے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اپنی سہیلیوں میں بیٹھی دل بہلا رہی تھی کہ غفورا کی آواز سنی۔ چھوٹی بیا ارے چھوٹی بیا۔ کیا بہری ہو گئی ہو؟ معصوم چھوٹی بیا اس ڈاکو کی آواز سن کر کانپ گئی اور لرزتی ہوئی آئی ؛

چھوٹی بیا۔ غفورا کیا کہتے ہو؟ لو ہم آگئے ؛

غفورا۔ کہتے کیا ہو خبر بھی ہے کیا ہوا؟

چھوٹی بیا۔ بدحواسی سے۔ کہو کہو خیر تو ہے کیا ہوا؟

غفورا۔ خیر دیر کیسی۔ آج میاں آپ سے بیحد ناراض ہیں اور حکم دیا ہے کہ چھوٹی بیا کے پان بند کر دو ؛

اس حکم کا سننا تھا کہ بیچاری چھوٹی بیا کے ہوش جاتے رہے گھبرا کر کہا تو اب؟

غفورا۔ تو اب کیسی؟ اور مجھے تنگ کیجئے۔ اور میری بالوں کو ٹال جائیے ؛

چھوٹی بیا۔ غفورا خدا کے لئے کوئی تدبیر نکال کہ میاں ہم سے خوش ہو جائیں ؛

غفورا۔ جی ہاں میں تو میاں کو آپ سے خوش کر دوں۔ مگر

آپ میری بات ..... کو کبھی نہ مانئے ٭

چھوٹی بیا ۔ غفورا ۔ اللہ قسم اب ہم تمہاری باتیں مان لیا کریں گے لیکن تم کسی طرح میاں کو راضی کر دو ٭

غفورا ۔ دیکھو چھوٹی بیا سچ کہو ٭

چھوٹی بیا ۔ اللہ قسم ہم سچ کہتے ہیں اور دیکھو قسمیں بھی تو کھا رہے ہیں ٭

رات کو جب ڈپٹی صاحب احباب کے ساتھ تاش کھیل کر فارغ ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ غفورا چاندنی پر بیٹھے ہیں اور دونوں ہاتھوں سے سر کو پکڑے خموش ہیں ٭

ڈپٹی صاحب ۔ غفورا ۔ او غفورا ۔ ابے کیسا خموش بیٹھا ہے؟

غفورا ۔ (ضعیف آواز سے) کچھ نہیں سرکار ٭

ڈپٹی صاحب ۔ ابے کچھ تو ؟

غفورا ۔ کیا کہوں حضور ۔ میرے تو ماں باپ ہیں تو حضور ۔ اور دین و ایمان ہیں تو حضور ٭

ڈپٹی صاحب ۔ اچھا اچھا مگر کچھ کہہ تو سہی ٭

غفورا ۔ کہوں کیا حضور مجھے چھوٹی بیا سے جس قدر محبت ہے (گویا نہایت پدرانہ!) وہ حضور پر ظاہر ہے ۔ یہاں پہنچ کر غفورا نے آواز بھاری کر کے آنکھیں جو ملیں تو ڈپٹی صاحب سمجھے ۔

کہ غفورا رو رہا ہے۔ اِس لئے پوری شفقت سے غفورا کے سر پر ہاتھ رکھ کر فرمایا +

ڈپٹی صاحب۔ ابے تو کیا لونڈیا نے تجھ سے کچھ کہہ دیا؟

غفورا۔ جی نہیں سرکار۔ وہ تو میری ہی غلطی ہے۔ میری ہی جہالت ہے کہ میں نے حضور سے چھوٹی بیا کے پانوں کی شکایت کر دی۔ بس بیا نے جو سنا تو اُس وقت سے حضور کے خوف سے کانپ رہی ہیں اور مجھ سے دیکھا نہیں گیا۔ چونکہ ڈپٹی صاحب کو یہ اطمینان ازل ہی سے تھا کہ واقعی غفورا کو چھوٹی بیا سے محض پدرانہ محبت ہے اس لئے چمک کر فرمایا:۔

ڈپٹی صاحب۔ چل چل چھوٹی بیا سے کہہ دینا کہ ہم نے معاف کیا۔ آٹھ جا کھانا کھا رات بہت گئی +

لیجئے ڈپٹی صاحب غفورا ہی کے کہے پر ناراض ہوئے تھے اور غفورا ہی کی سفارش پر خوش ہو گئے۔ مگر یہ نہ کیا کہ ذرا اس معصوم و بے گناہ چھوٹی بیا سے بھی اصل معاملہ کی تحقیق فرما لیتے +

صبح ہوئی تو ڈپٹی صاحب کے نئے میاں گھبرائے ہوئے غفورا کے پاس آئے۔ اور ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ غفورا آج تو اسکول جانے میں بہت دیر ہو گئی۔ لاؤ ہماری کاپی کے پیسے جو میاں نے تمہارے پاس ہمارے لئے رکھوائے ہیں +

غفورا۔ چلو چلو میں اس وقت میاں کے جوتے پر پالش کر

رہا ہوں کچہری کا وقت ہو چکا ہے ٭

ننّے میاں - تو غفورا اور جو ہمیں ماسٹر صاحب سزا دینگے ؟

غفورا - بھنّا کر - تو مَیں کیا کروں - میری ایک جان ہے اب چاہے تم لے لو - یا میاں لے لیں ٭

ننّے میاں - اچھّا اچھّا غفورا خفا نہ ہو - ہم دوپہر کی چھٹی میں آکر لے لینگے - یہ کہا اور بیچارے آہستہ سے اسکول چلے گئے ٭

اسکول جو پہنچے تو ماسٹر صاحب نے کاپی نہ لانے پر ننّے میاں کے نازک اور پھول سے جسم پر پہلے تو رسید کئے دو اوپر دس بید اور پھر بنچ پر کھڑا کر دیا - اب بیچارے ننّے میاں یہ بھی نہ کہہ سکے کہ والد بزرگوار نے ہم لوگوں کو اپنے معتمد غفورا کے چارج میں دے رکھا ہے - بلکہ آنسو پونچھ کر آگئے چپ چاپ گھر ٭

یہ تھے انیسویں صدی کے وہ نمک حلال خدمتگار غفورا جو اپنے عافل و عیش پسند آقا کی اولاد اور اُن کے خاندان پر اس طرح حکمراں تھے - اور کیا کہیں کہ کیا تھے -

ڈپٹی صاحب کے خاندان کے بعد غفورا ڈپٹی صاحب کے ماتحت ملازمین اور ڈپٹی صاحب کے مفلس دوستوں پر بھی حکومت فرمانے کے عادی ہو چکے تھے اور ہم دیکھا کرتے تھے کہ جب کسی غریب اور مفلوک الحال دوست نے آکر غفورا سے دریافت کیا کہ کیا

ڈپٹی صاحب تشریف رکھتے ہیں ؟

غفورا نے صاف کہہ دیا آرام میں ہیں - باہر نہیں آسکتے - مہمانوں نے اگر غفورا سے کوئی خدمت لی تو اوّل صاف انکار - یا پھر صبح کی فرمائش شام کو پوری کی - آخر جناب کب تک - ایک دن غفورا نے ہمیں جو ڈانٹا تو ہم نے بھی یا علی کہہ کر پہلے تو اُن کے رخسارے پر . . . . رسید کیا اور پھر ڈپٹی صاحب جو آئے تو رکھ دیا ہم نے اپنا سُوت کی رسّی سے بندھا ہوا بستر اُن کے سامنے اور سفری لوٹا ہاتھ میں لے کر کہا - السلام علیکم - ڈپٹی صاحب نے گھبرا کر کہا ہیں ہیں مولانا ! خیر تو ہے - کہاں کہاں ؟ ہم نے کہا - بس جناب - ہم سے آپ کے غفورا کی حکومت دیکھی نہیں جاتی - یہ کہہ کر ملعون غفورا کے تمام پوست کندہ حالات انہیں سُنا ئے - اور بتا دیا کہ دیکھو یہ ڈاکو تمہاری اولاد اور گھر بھر کے لوگوں سے کس قسم کا ناگفتہ بہ سلوک کر رہا ہے . . . وغیرہ - مگر ڈپٹی صاحب نے اس بدکردار کی تمام بداعمالیاں سُن کر جو جواب دیا اس سے ڈپٹی صاحب کی غیرت کا اندازہ فرمایئے - ارشاد ہُوا کہ -

"ہاں مولانا غفورا ہے تو بہت شوخ"

تب ہم نے آٹھ دِن گھر پر رہ کر غفورا کے جو راز ہائے درون پردہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ڈپٹی صاحب کو سنائے - ان کا

اثر آپ کی غیرت پر اتنا ہی ہُوا کہ آپ نے غفورا کو صرف شوخ کہہ دیا۔
اور بس ٭

آہ! آج مسلمان امراء اور دولتمندوں کے کتنے خاندان ہیں۔ جو نوجوان لونڈوں کو اپنا معتمد ملازم بنا کر اپنی عزت و ناموس اور دولت کو برباد کرا رہے ہیں۔ مگر ملازم کے ادنیٰ آرام کو ترک کر کے اس کی دیکھ بھال نہیں کرتے۔ اگر تہذیب اجازت دیتی تو میں ایسے بدکردار ملازمین۔ اور خدمتگاروں کے وہ سیاہ اعمال بھی پیش کر دیتا جو اکثر خاندانوں کی تباہی کا باعث ہوئے ہیں۔ اور غیور و باحیا گھرانوں میں تو جانیں بھی ضائع ہو چکی ہیں ٭

پھر کیا میرے عزیز از جان مسلمان امراء اپنے خدام اور بظاہر وفادار ملازمین سے اپنی اولاد اور خاندان کو محفوظ رکھنے پر متوجہ ہونگے؟ بہترین تدبیر یہی ہے کہ آج کل کے ملازمین سے صرف خدمتگار کا سا سلوک رکھا جائے اور بس ؎

من آنچہ شرط بلاغ است با تو میگویم
تو خواہ از سخنم پند گیر۔ خواہ ملال

مُشاعرہ

باعث تحریر آنکہ مشاعرہ ایک ایسی چیز ہے جو نہ فقط شعرو
شاعری کے لئے ایک معیار اور کسوٹی کا کام دیتا ہے بلکہ اسی کے
ذریعہ اقوام اور جماعتوں کی ذہنی فضا بدلی جاتی ہے + وہ جبکہ دنیا
کے کسی شہر سے بھی اخبار زمیندار - اور رسالہ حسن خیال شائع نہیں
ہوتا تھا - یعنی دنیا میں عام مخاطبت اور تبلیغ کے لئے اخبارات
اور رسائل کا وجود نہیں تھا - تو مکے شریف کے بدوؤں نے یہ ترکیب
اختیار کی - کہ میدان میں ایک میلہ لگایا اور لگے اس میں مطلع عرض
کرنے + اس سے یہ فائدہ ہوا کہ ایک شاعر کا کلام دوسروں تک
پہنچ گیا + لیکن آج شاعری کا بہترین معیار یا مبلغ اخبار اور رسالہ
ہوگیا ہے + معیار اس لئے کہ اگر غزل غلط ہو - لغو ہو - بے فائدہ
ہو تو اخبار اسے شائع ہی نہیں کرتا اور شاعر صاحب خون کا
گھونٹ پی کر سمجھ جاتے ہیں - کہ غزل صحیح نہیں تھی - اور مبلغ اس
لئے کہ جو غزل اخبار یا رسالہ میں چھپ گئی - وہ دائیں سے بائیں ہند
کی روبکاری تک پہنچ کر رہتی ہے + پس غزل کی اشاعت کے
اس نئے طریق کے ساتھ ہی مشاعرہ کا ڈھنگ بھی بدل گیا -
اور اب بجائے مکانوں - کوٹھیوں - بنگلوں - اور اٹاریوں کے یہ

میدانوں میں برپا ہو جاتا - جہاں بیشمار آدمی تالیاں بجا دیتے ہیں
اور ایسے میدانی مشاعروں کو "آل انڈیا مشاعرہ" کہتے ہیں + پس
جب سے یہ "آل انڈیا شاعر" پیدا ہو گئے ہیں - اُس وقت سے
مشاعرہ ایک کچہری بن گیا ہے - جس میں حاکم عدالت یعنی صدر
بھی ہوتا ہے - اور پیشکار یعنی میر مشاعرہ بھی + جس طرح یہ انگریز
لوگ قتل کے مقدمہ کو بھی چھوڑ کر بارہ بجے لنچ کھانے کے لئے اُٹھ
جاتے ہیں - اسی طرح مشاعرہ میں دور رکھے جاتے ہیں - اور غزل
پڑھتے پڑھتے تمام شاعر باہر جا کر خوب جمائیاں لیتے ہیں
انگڑائیاں لیتے ہیں اور بیڑی سگریٹ یا حقہ پی کر پھر بیٹھ جاتے
ہیں + اسے مشاعرہ کا دور ثانی کہتے ہیں + مگر یہ تمام باتیں ابھی
لکھنؤ - دہلی - لاہور اور بمبئی میں شروع ہوئی ہیں + کہتے تو یوں
ہیں کہ دنیا میں ہر چیز کی متوسط حالت اچھی ہوا کرتی ہے لیکن
یہ ہندوستان کے ایک "صوبجات متوسط" بھی ہیں - جن کی کوئی
کل سیدھی نہیں ورنہ ہونا تو یہ چاہیئے تھا - کہ ہندوستان کی ہنر
علمی - ادبی - تاریخی - قومی - سیاسی - اور ماہوار تحریک اسی خطہ
ہند سے پیدا ہوتی - بڑھتی اور کامیاب ہوتی - لیکن حالت یہ ہے
کہ وسط ہند نام ہے - مگر نہ یہاں سے ایک اخبار نکلتا ہے اور
نہ ایک رسالہ - اور مشاہیر ارباب علم و فضل کا تو وجود ہی عنقا
ہے - بس ایک "تان سین" پیدا ہوئے تھے سو ان کا بھی عرصہ سے

ریاست گوالیار میں معاملہ بالخیر ہوگیا اب سالانہ عرس ہوا کرتا ہے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ صوبجات متوسط میں بس قوال ہی پیدا ہوتے ہیں دوسری نامور ہستیوں میں حضرت گلا دو پیازہ کا نام آتا ہے۔ لیکن وہ بھی مقام ہنڈیا ہروہ میں مزار پر انور بنے پڑے ہیں اور کوئی فاتحہ تک کو نہیں جاتا + رہ گئے ہم حضور گلا رمونہ ہی سو اگر قدردانی کی یہی فضا طاری رہی تو سن لینا کہ ہمارا بھی رشاندار جلوس نکل گیا + پھر ایسی علم سوز اور مردم کش سر زمین میں مشاعروں کا برپا ہو جانا خواجہ حسن نظامی کا فیض نہیں تو اور کیا ہے؟

اوّل تو شاعری کا ذوق ارباب علم و فضل میں پیدا ہی نہیں۔ کیونکہ لازمۂ تحصیل علوم خشکی ہوا کرتی ہے تازگی نہیں + علوم میں کامل دستگاہ ہوگئی تو بس ہنسی۔ مذاق۔ لطفِ کلام۔ اور عشق و عاشقی سے کام نہیں۔ جب دیکھئے خموش و ساکت اور سنجیدہ فضیلت کے بعد جب تک دن بھر خموش نہ رہے تو کوئی قابل ہی نہیں کہتا + اس لئے اب شاعری بجائے ارباب علم و فضل کے نابالغ لونڈوں دفتر اور کچہریوں کے "منشی جی" میں پیدا ہوتی ہے۔ اور ایسے ہی کم عمر اور کم علم آج کل ملک الشعراء۔ استاد الشعراء۔ حمار الشعراء اور خدا جانے کیا کیا شعراء ہوا کرتے

ہیں + پھر ایسے حضرات اُردو شاعری کو جس درجہ ترقی دے سکتے ہیں - اور اُن کے مشاعرے جس درجہ باوقار اور علمی ہو سکتے ہیں - آپ ہی اندازہ کر لیجئے +

ایک لفافہ ملا - جس میں لکھا تھا کہ - ذیل کے مصرعہ پر طبع آزمائی فرما کر مشاعرہ کو ممنون فرمایئے - اور اپنے احباب کو بھی ساتھ لایئے + اوپر کی عبارت کو تو مشاعرہ کا اذن سمجھا - مگر یہ " احباب کو بھی ساتھ لایئے " کو کچھ نہ سمجھے + وقت مشاعرہ ٹھیک ساڑھے نو بجے شب تھا - مگر جب تہجد کی اذان کا وقت شروع ہوا تو آواز آئی +

" شروع کیجئے "!

صف اوّل کے کوئی پانچ اور پر بیس صاحب زادوں نے جو مطلع عرض کئے ہیں - تو آئی نیند نہ آرد - اور خواجہ حسن نظامی صاحب کے ہاں کی " قوالی " کا لطف آگیا - جہاں ہارے " سبحان اللہ " اور " واہ وا " کے انسان سو نہیں سکتا + اُن لونڈوں کے بعد طبقہ متوسط کے شعراء نے عرض کیا - اور ہم واہ وا کے گنبد میں جھومتے رہے + اب اساتذہ کی باری آئی - تو محفل کی تمام لالٹینیں آپ کے سامنے جمع کر دی گئیں + اُستاد صاحب نے بھی دامن سنبھالے - چشمہ نکالا - لگایا - سنبھالا - پھر مسکرائے - پھر اِدھر اُدھر دیکھا - پھر کھانسے - پھر سکوت فرمایا + اُستاد کے اِس بناؤ سنگھار میں شمع کی پچھلی صفیں اگلی صفوں کو چیر کر مع " جوتوں " کے

اُستاد تک پیش قدمی کر آئیں - اور اب جو اُستاد صاحب نے "عرض کیا" تو نہ پوچھئے عالم تہ و بالا نظر آتا تھا + موافق طبقہ "سبحان اللہ" کے سوا لاحول ولا جانتا ہی نہ تھا - البتہ مخالف طبقہ پھبتیوں سے تواضع کر رہا تھا - اور اس پھبتی پر دونوں جماعتوں میں "چل گئی" تو پھر کیا تھا ایسا معلوم ہونے لگا - کہ کہیں ہندو مسلم فساد ہو گیا ہے - اور جوتا - لاٹھی - اور اینٹ سے خوب خوب کام لیا جا رہا ہے + خدا خدا کر کے ہنگامہ فرو ہوا تو ہم نے فوراً یہ مقطع عرض کیا کہ ؎

غزل وزل تو نصیبوں سے ہے ولے اے میر
مشاعرہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

یوں ہوا کرتے ہیں اردو کے مشاعرے - جن کے اندر علمی وقار - سکون - تہذیب - اور ادبی شان کی جگہ بازاری پن کا کافی ثبوت ملتا ہے + کیا ارباب مشاعرہ اس خالص علمی و ادبی مجلس کے وقار کے لئے اپنے رنگ کو بدلنے کی کوشش کرینگے ؟

غنودگی

انسان کے اندر "غنودگی" بھی خدائے فیاض کی دی ہوئی نعمتوں میں سے وہ لطیف تر نعمت ہے۔ جس کے شکر سے عہدہ برآ ہونا کم از کم ہمارے امکان سے تو قطعاً باہر ہے۔ دُنیا کے عظیم الشان مدبر۔ جلیل القدر سپہ سالار۔ باوقار علماء۔ صاحب عظمت وزرا۔ اور شوکت پناہ شہنشاہ۔ سب اس نعمت سے بقدر ظرف بہرہ یاب ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ یعنی سب "اونگتے ہیں"۔ غلط ہے۔ کہ اس کیفیت کا نمایاں اثر صرف افیونی حضرات پر زیادہ ہوتا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں۔ کہ گانجا۔ چرس۔ اور بھنگ اس تاثیر کے محرک ہیں۔ بلکہ یہ جان پرور کیفیت ان سب کی امداد بغیر پیدا ہوتی ہے۔ اور جب پیدا ہوتی ہے۔ تو انسان دنیا و مافیہا سے یک لخت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس کمترین نے جہاں تک غور کیا۔ غنودگی کا تعلق تین چیزوں سے بہت کافی پایا۔ عمر۔ موسم۔ اور قوائے جسمانی۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے۔ کہ پچاس برس کی عمر کے بعد سے لوگ دیوار کے سہارے بیٹھے بیٹھے یکایک ..... اگر انہیں کسی نے زور سے آواز دی۔ تو نیم باز آنکھوں سے ذرا دیکھ لیا اور پھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

موسمی لحاظ سے غنودگی کا غلبہ گرمی کے موسم میں خاص شدت

کر لیتا ہے۔ اکثر یہی ہوا ہے کہ کھانا کھا کر پلنگ تک جانا محال ہو گیا ہے۔ اور بعض بزرگ تو دسترخوان ہی پر ..... مگر قوائے جسمانی کے لحاظ سے مذکورہ دونوں اصول غلط ثابت ہوتے ہیں جبکہ ہم ریل گاڑی میں معاملہ اس کے بالکل برعکس پاتے ہیں۔ چنانچہ آپ ریل گاڑی میں چاہے جس قدر نوجوان تندرست آدمی کو سوار کر دیجئے۔ اور چاہے جس موسم میں سوار کر دیجئے۔ وہ ایک اسٹیشن تک تو کھڑکی سے مناظر قدرت کی سیر میں مصروف رہیگا۔ مگر دوسرے اسٹیشن سے تیسرے اسٹیشن تک کے درمیانی فاصلہ میں وہ کم از کم ایک سو ایک مرتبہ ..... اگر اسٹیشن پر "گاڑی تین منٹ ٹھیرے گی" کی آواز سے وہ بیدار بھی ہو جائے۔ تو گاڑی روانہ ہوتے ہی وہ پھر ..... غنودگی کا غلبہ۔ یوں تو بے حد راحت بخش اور حلاوت اندوز ہے۔ لیکن یہ بعض جگہ نہایت نقصان رساں بلکہ توہین انگیز ہوتا ہے۔ جہاں غنودگی کے پہلے ہی حملہ میں بستر اور صندوق ندارد۔ اور اس لئے اللہ بخشے ہمارے بڑے مولوی صاحب ریل میں اپنا صندوق اپنے کمر بند سے باندھ کر بیٹھتے تھے۔ دوسرا نقصان مطالعہ کے وقت ہوتا ہے۔ جہاں آپ نے کتاب کا صفحہ ڈیڑھ صفحہ پڑھا کہ ..... خصوصاً ایسے طلبہ پر اس کا زیادہ اثر ہوتا ہے۔ جو انٹرنس کے امتحان کے لئے تیاری میں مصروف ہوتے ہیں۔ اگرچہ نوجوان طلبہ بھی اس کے

انسداد کی تدابیر اختیار کرتے ہیں۔ مگر سب بے سود مثلاً ہمارے ایک مستعد شاگرد نے غنودگی سے تنگ آکر کرسی پر بیٹھ کر پڑھنا شروع کیا۔ جو اس حد تک مفید ثابت ہوا کہ وہ مسلسل بارہ صفحات پڑھ گئے۔ لیکن اس کے بعد کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مع کرسی ... غصہ میں آکر انہوں نے دوسری تدابیر اختیار کی یعنی اس مرتبہ انہوں نے انگریزی کرسیاں پھینک کر مشرقی قالین کے فرش پر بیٹھ کر پڑھنا شروع کیا۔ جس کے معنی یہ تھے کہ اب غنودگی کا کوئی حملہ کامیاب نہیں ہوگا۔ بے شبہ وہ دیر تک پڑھتے رہے لیکن اس کے بعد انہوں نے صرف دونوں کہنیاں قالین پر جما دیں۔ پھر آہستہ سے دونوں پاؤں پھیلا دئے۔ اور مطمئن تھے کہ غنودگی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی کہ ..... ہم نے جاکر دیکھا۔ تو کتاب پر سر دھرا ہوا تھا۔ اور خود ... بیدار کیا تو جھنجھلا کر رہ گئے۔ اور منہ ہاتھ دھو کر آئے اور اس مرتبہ بہت زور سے چلا چلا کر پڑھنا شروع کیا۔ مگر ابھی آواز میں کوئی دلپسند سر بھی پیدا نہ ہوا تھا کہ .....

یہ تو تھے غنودگی کے نقصان رساں پہلو۔ توہین انگیز پہلو۔ نماز باجماعت اور محفل وعظ و میلاد میں دیکھے گئے ہیں۔ مثلاً موسم گرما کی نماز ظہر میں امام صاحب کوئی طویل ترسورت پڑھتے ہیں۔ لہذا اگر آپ مسجد کی صف میں کسی معزز آدمی کے برابر نماز کے لئے کھڑے

ہوگئے۔ تو سمجھ لیجے کہ توہین ہوکر رہیگی۔ مثلاً جہاں امام صاحب الحمد شریف سے آگے بڑھے۔ کہ آپ کو تمام جسم میں ایک لطیف سنسنی محسوس ہوگی تو آپ ایک پاؤں پر کھڑے ہو جائینگے۔ اور دوسرے پاؤں کو آرام دینگے۔ لیکن سنسنی بڑھتی جائیگی۔ اور آپ کی گردن خود بخود گریباں کی طرف جھک جائیگی۔ پھر کچھ دیر بعد آپ نیت باندھے پاس والے نمازی پر دھڑا دھڑ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب اگر اس حالت میں امام نے رکوع کیا تو آپ کو رکوع کرنا محال سا معلوم ہوگا۔ مثلاً آپ نیت کے ہاتھ تو چھوڑ دینگے۔ مگر رکوع کے لئے خمیدہ ہونا معلوم۔ اسی طرح پہلے سجدہ کے بعد جب امام صاحب ہاتھوں کو دوسرے سجدہ میں جانے کے لئے جنبش تو دینگے۔ مگر درمیان ہی میں ۔ ۔ ۔ پھر کچھ سر اٹھا کر پڑھنا چاہینگے کہ یہاں تک کہ امام صاحب سجدہ سے سر اٹھا لینگے۔ تو آپ گھبرا کر یا تو سجدہ میں بغیر امام کے چلے جائینگے یا نادم ہوکر ایک ہی سجدہ پر قناعت کر لینگے۔ اور ہمیں تو نماز باجماعت میں غنودگی کا یہاں تک تجربہ ہے۔ کہ امام صاحب نے نماز ختم کرتے ہوئے کہا۔ اسلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ مگر یہاں قاعدۂ اخیر ہی میں بیٹھے رہے۔ جب پاس والے نمازی نے کہنی مار کر بیدار کیا تو معلوم ہوا کہ نماز ختم ہوگئی۔ مگر فوراً سبحان اللہ اور الحمد للہ کہہ کر غنودگی کی خفت کو کم کیا جو ناکام رہی۔ اور اللہ بخشے بڑے مولوی صاحب چلا کر

کہتے تھے ۔کہ جب ایسی ہی نیند آتی ہے ۔تو جماعت سے نماز ہی کیوں پڑھتے ہو ؟ اور امراء نے شاید اسی لئے نماز جماعت ترک کر دی ہے ! ؟

وعظ یا میلاد کی محفل میں اگر کہیں جگہ ناکافی ہو اور اور لوگوں میں گھر کر بیٹھ جایئے اور وعظ کہنے والے قسمت سے بریلی ۔ بدایون ۔ مراد آباد یا دیوبند کی طرف کے ہوں تو پھر دس بجے رات کے بعد سے غنودگی کا سلسلہ یقینی طور پر شروع ہو جاتا ہے ۔ اور لوگ پہلے آہستہ سے آنکھیں کھولنا اور کبھی بند کرنا اختیار کرتے ہیں ۔ اور اگر کسی ایسی جگہ بیٹھ گئے ۔ جہاں محفل کی روشنی چہرہ تک نہیں آتی تو پھر غنودگی نہایت اطمینان سے آپ کی گردن کو گریبان کی طرف جھکا دیتی ہے ۔ پھر دونوں گھٹنے کھڑے کر لئے جاتے ہیں ۔ اور ان پر دونوں ہاتھ رکھے جاتے ہیں ۔ اور اب جیسے ہی گردن جھکائی کہ . . . . . آنکھ کھلی تو کہا سبحان اللہ اور پھر . . . . . اس موقعہ پر سبحان اللہ کے یہ معنی ہوا کرتے ہیں کہ ہم وعظ بہت غور سے سن رہے ہیں ۔ اونگتے نہیں ہیں ۔ حالانکہ لمحہ بہ لمحہ . . . . تا آنکہ وعظ ختم ہو گیا ۔ لیکن یہاں ہیں کہ . . . . . اور اگر وعظ والے مکان میں غنودگی کے وقت سہارے کے لئے کوئی دیوار ہاتھ آگئی ۔ تو پھر تمام محفل والے اپنے اپنے گھر جا پہنچے ۔ لیکن یہاں دیوار سے تکیہ دیئے . . . . . آخر کار صاحب مکان آتا

ہے۔ اور کہتا ہے اُٹھئے حضرت یہ تبرّک لیجئے۔ تب کہیں ایک بڑی سی جمائی لیکر لاحول ولا کہتے ہیں۔ اور باول ناخواستہ گھر تک آنا پڑتا ہے ؂

ہم کوئی حیدر آباد کے وظیفہ یافتہ یا منصب دار اہل قلم تو نہیں ہیں۔ کہ فکر معاش سے بالکل آزاد رہ کر دن کی بہترین روشنی میں انشا پردازی فرماتے رہیں۔ بلکہ دن بھر تو رہتے ہیں۔ دفتر کے "منشی جی" ادھر شب کے ابتدائی حصّہ میں ننھے میاں کو کھلاتے رہتے ہیں۔ جب وہ سو جاتے ہیں اور وہ بھی سو جاتی ہیں۔ تو آنکھ بچا کر مضمون شروع کرتے ہیں۔ اور کوئی ایک اوپر تیس اخباروں اور رسالوں کے لئے اس وقت مضامین تیّار کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے۔ کہ اس شب بیداری سے خدا معاف کرے۔ صبح کی نماز ..... مگر اس کو کیا کہئے کہ دین و دنیا کی وجہ نجات۔ محترمہ والدہ صاحبہ اذانوں کے وقت سے اُٹھانا شروع کر دیتی ہیں۔ ادھر ممدوحہ کا اثر اور رعب اس قدر ہے۔ کہ چوں نہیں کر سکتے جہاں ممدوحہ نے آواز دی بھیّا! اور ہم فوراً جی بہت اچھّا کہہ کر چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ اور آنکھیں مل کر دیکھا۔ کہ اماں جی کدھر ہیں۔ اگر وہ اپنے کمرہ میں نماز کے لئے تشریف لے گئیں تو اب غنودگی نے ہمیں آلیا۔ اور ہم نے پھر تکیہ کی طرف رُخ کیا۔ اور درمیان ہی میں ..... مگر اماں جی

بھی خوب جانتی ہیں۔ کہ ہم آدھ گھنٹہ تک اونگتے رہتے ہیں۔ اِس لئے وہ بھی آوازوں کا تار باندھ دیتی ہیں جہاں ہمیں دیکھا۔ کہ ہم . . . کہ اُنہوں نے فوراً ہُوں ہُوں اور ہم فوراً تیزی سے ہوشیار تو ہو گئے مگر پھر . . . . اب چارپائی سے نیچے پاؤں لٹکا دیئے۔ مگر آنکھیں بند اور . . . کہ پھر اُنہوں نے پکارا بھیّا سورج نکلنے والا ہے۔ اب ہم نے تکیہ کو پاؤں پر رکھ کر جھومنا شروع کیا۔ کہ پھر بھیّا! اور ہم فوراً سنبھل گئے ایک دو مرتبہ مُنہ پر ہاتھ پھیرا۔ کبھی ڈاڑھی کی طرف ہاتھ لے گئے کہ پھر . . . یہاں تک کہ اب ننھے کی اماں نے ہمارے پاس پانی کا لوٹا بھی لاکر رکھ دیا۔ تو ہم نے اُنہیں بہت غصّہ سے دیکھا۔ مگر اُنہوں نے اماں بی کو سُنانے کے لئے مسکرا کر اور بھی زور سے کہا۔ اُٹھتے کیوں نہیں ہو۔ بیٹھے اونگ رہے رہے ہو۔ وہ تو یہ کہہ کر ہنستی ہوئی کمرے میں بھاگ گئیں اور ہم جھنجھلا کر لوٹا ہاتھ میں لئے گھر کے "میونسپل بورڈ" کی طرف چلے اب حسب دستور عام صبح چونکہ ہر گھر کے "میونسپل بورڈ" میں حاجتمندوں کی کثرت ہُوا کرتی ہے۔ لہٰذا اگر اندر سے کسی کے کھانسی کی آواز آگئی تو ہم وہیں لوٹا ہاتھ سے رکھ کر بیٹھ گئے اور لگے . . . . یہاں تک کہ خاصی صبح ہو گئی۔ اور ہم . . . . غرض دُعا ہے۔ کہ خدا صبح کی عنودگی

سے ہر شریف آدمی کو بچائے ۔ اگر دہلی کے بڑے . . . .
حکیم جی اس کا کوئی نسخہ تجویز فرمائیں ۔ تو ایک بوتل کے
خریدار ہم بھی . . . . . ✤

Taj Tahir Foundation

پھر بمبئی تک

اور تو جو کچھ بھی سہی لیکن یہ غنیمت ہے کہ ہمارے ہندوستان کے مہاجن لوگ ریل کے سفر میں کسی "خانصاحب قسم کے مسافر" کے دو چار چانٹے کھا کر اب بھی خموش بیٹھ جاتے ہیں۔ البتہ یہ انگریزی تعلیم کے باغیانہ اثرات سے اس قدر تبدیلی ضرور ہوگئی ہے کہ یہ لوگ کبھی کبھی سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ خرید لیا کرتے ہیں۔ لیکن اگر سیکنڈ کلاس میں ایک درجہ سوم کا انگریز بھی انہیں نظر آگیا تو بیچارے مع ٹکٹ تھرڈ کلاس میں آکر بیٹھ جاتے ہیں اور کسی سے کوئی شکایت نہیں کرتے ؛

ان لوگوں کے پاس ایک نیلام شدہ ٹین کا بکس۔ کثیف و غلیظ کپڑوں کی گٹھری میں ایک میلی سی دھوتی۔ مونگ کے چند خشک لڈو اور پیتل کا ایک لوٹا ہوا کرتا ہے۔ یہ لوگ ریل میں تمام راستہ گلا پھاڑ پھاڑ کر ہائیں کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس لئے جس ڈبے میں ایک مہاجن آ بیٹھے ایمان سے آؤ کہ اس ڈبے کا امن عامہ برہم ہو کر رہیگا۔ اب اگر اس شور پر آپ اُن کو ایک ہلکی سی ڈانٹ پلا دیجئے تو پھر سیٹھ جی

راستہ بھر آپ کو غصّہ کے تیوروں سے گھورتے تو جائینگے مگر زور سے بات نہ کر سکینگے ۔ بریلی ۔ بدایوں اور دیوبند والے مسواک ۔ رسّی سے باندھا ہوا ٹین کا لوٹا ۔ مصلّے ۔ حمائل شریف ۔ تہ بند ۔ رسّی کے ٹکڑوں سے کسا ہوا موٹا سا بستر اور سلسل بول کے لئے مٹّی کے ڈھیلے لے کر ریل پر سوار ہو جاتے ہیں ۔ ٹکٹ گھر کے ہجوم ۔ پلیٹ فارم کے قتل عام اور ریل کے اندر کسانوں کی چپقلش پر لاحول ولا سے عظیم تک کی عربی بولتے رہتے ہیں ۔ اودھ اینڈ روہیلکھنڈ کے طرف کے لوگ غسل کے بعد آنکھوں میں سُرمہ لگاتے ہیں ۔ عینک لگاتے ہیں ۔ بازو پر امام ضامن اور ہاتھ میں مراد آبادی پاندان لیکر ریل پر سوار ہو جاتے ہیں ۔ پھر ریل میں مسافروں سے تمام راستہ تقریر کرتے جاتے ہیں اور تمام گفتگو کا خلاصہ یہ ہوتا ہے کہ ہم شاہی خاندان سے ہیں ۔ دادا مرحوم ضلع بارہ بنکی کے رئیس تھے ۔ والد مرحوم اودھ کے ممتاز تعلّقہ دار رہے اب ڈپٹی کلکٹری سے جو ناانفاقی ہو گئی سو اُس نے وثیقہ بھی ضبط کر لیا ہے ۔ نواب لڈّن میرے بہنوئی اور نواب اچھّن میرے خسر ہوتے تھے وغیرہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یہ لوگ مراد آبادی پاندان سے راستہ بھر گلوریاں پیش کرتے جاتے ہیں ۔ یعنی بہت متواضع ہوتے ہیں ۔ امیروں کے سفر میں بہرے خدام اور سکریٹری لوگ شامل ہوتے ہیں ۔ یہ لوگ تمام

درمیانی اسٹیشنوں پر ڈائنگ کار سے انگریزی چائے اور بسکٹ کھاتے پیتے رہتے ہیں۔ بک اسٹالوں سے انگریزی زبان کے اخبار رسالے اور ناول خریدتے جاتے ہیں۔ یورپ کے لوگ ہندوستانی ریلوں میں نہایت شاندار سفر کرتے ہیں۔ اُن کے ہمراہ بے شمار بکس اور بستر ہوتے ہیں۔ اُن کی اُن کے ہاتھ میں کتے کی زنجیر ہوتی ہے۔ کہیں کہیں ہندوستانی مسافروں کو ٹیم بھی کر دیتے ہیں اور قلی کو ٹھوکر مار دیتے ہیں۔ اُن میں سے بعض کا ٹکٹ سکنڈ کلاس کا ہوتا ہے۔ لیکن پکڑے جاتے ہیں فرسٹ کلاس میں ÷

مذکورہ مسافروں میں سب سے زیادہ خوفناک مسافر ہندوستانی افسر ہوتا ہے ÷

اس کے ساتھ سوٹ کیس۔ ہیٹ کیس۔ شیپ کیس۔ سگریٹ کیس۔ سگار کیس اور شب خوابی کے لئے انگریزوں کا ڈھیلا پاجامہ پری جمال صابون۔ بال صفا پوڈر۔ سیفٹی ریزر اور اخبار پانیر ہوتا ہے اور اگر رشوت کی آمدنی معقول ہوئی۔ تو ایک قحط زدہ ہندوستانی ملازم بھی ساتھ ہوتا ہے۔ جب اس ٹھاٹ کے ساتھ یہ ہندوستانی افسر ریل میں سوار ہو جاتا ہے اور ریل روانہ ہونے پر لیٹ کر اخبار پانیر پڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ تو مارے غرور

کے اپنے پاس بیٹھنے والے بڑے سے بڑے شریف ہندوستانی کو لال مُرلی دھر سے زیادہ وقعت نہیں دیتا ٭

اتفاق تو دیکھئے کہ اس مرتبہ بمبئی تک کے سفر میں ہمارا ساتھ ایک ایسے ہی فرعون مزاج بزرگ کا ہوگیا ٭

آپ سب صاحب خوب جانتے ہیں کہ جب کوئی ہندوستانی ریل کا سفر کرتا ہے تو اُس پر اور اُس کے تمام گھر والوں پر ایک عام وحشت اور گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے اور جوں جوں ریل کا وقت قریب آتا جاتا ہے یہ گھبراہٹ جنون کی حد تک پہنچ جاتی ہے اگر اس وقت مسافر صندوق میں ٹوپی رکھنا چاہتا ہے تو گھبراہٹ میں جوتے بند کر دیتا ہے۔ شیروانی کی جگہ پاجامہ اور پاجامہ کی جگہ عمامہ بند کر دیتا ہے۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ نہایت اِطمینان سے تمام سامان صندوق میں بند کر کے اس کی چابیاں بھی صندوق میں رکھ کر قفل ڈال دیتے ہیں اور پھر تمام گھر میں چابیاں تلاش کی جاتی ہیں۔ کبھی ریل کے کرایہ کے لئے نوٹ نکال کر ہاتھ میں رکھ لئے لیکن گھبراہٹ میں یہی نوٹ تمام گھروں میں ڈھونڈھتے پھرتے ہیں۔ قریب قریب ایسی ہی وحشت ہمارے اوپر سوار ہو جاتی ہے۔ اور جب سفر کا دن آ ہی جاتا ہے تو ہم مارے وحشت کے کسی بھلے مانس سے ملنے کے قابل نہیں رہتے۔ اور گو وہ نہایت

سلیقہ مند اور اسکول کی تعلیم پائی ہوئی ہیں مگر اس کو کیا کہئے کہ سفر
کے دن ہماری پیش از قیاس وحشت سے وہ بھی حواس باختہ
ہوجاتی ہیں یہاں تک کہ اس مرتبہ خود اُنہوں نے ہمارے سفری
ناشتہ دان میں پان بند کر دیئے اور ہم سے کہا کہ میں نے ناشتہ
دان میں انڈے بھی رکھ دیئے ہیں۔ غرض ایسی وحشت کا اثر
یہ ہوتا ہے کہ مسافر ضروریات سفر تو گھر میں چھوڑ جاتا ہے اور
غیر ضروری چیزیں ساتھ چلی جاتی ہیں۔ پھر تمام راستہ وہ ہوتا
ہے اور لفظ استغفر اللہ ہوتا ہے۔ پھر ضروریات سفر کے عین
موقع پر نہ ملنے سے جس قدر غصّہ پیدا ہوتا ہے اس کا اثر کبھی
کبھی یہ بھی ہوجاتا ہے کہ ہم آدھے راستے سے گھر واپس ہونے
پر تیار ہوجاتے ہیں اور جو کبھی ریل کے لائن کلیر کی طرح ٹکٹ
بھی ہر اسٹیشن پر نیا خریدنا پڑتا۔ تو آپ سُن لیتے کہ ہم مارے
غصّہ کے کئی مرتبہ آدھے راستہ سے گھر لوٹ آئے ہوتے۔ مگر
مصیبت یہ ہے کہ ٹکٹ سیدھا بمبئی تک کا دیتے ہیں اور اسے
واپس نہیں لیتے۔ اور اسی لئے تو کہتے ہیں کہ اگر سوراج مل
گیا تو جہاں چاہینگے ریل گاڑی روک لیا کرینگے جس دوست
کو چاہینگے بغیر ٹکٹ کے سوار کر لیا کرینگے۔ اور افسروں کا ٹکٹ
تو ہُوا ہی نہ کریگا۔ جیسے ہندوستانی تھیٹر والے پولیس افسروں
کے لئے اُلٹے ہاتھ جوڑ کر پاس بھیج دیا کرتے ہیں۔ ہمارا سفر

دو صورتوں میں واقع ہوتا ہے یا کہیں سے تار آئے کہ :-
"اگر صورت دیکھنا ہو تو جلد آؤ"
یا کوئی مخلص مسلمان ہماری تکالیف سے متاثر ہو کر ہمیں تفریح
کرانے یا آب و ہوا تبدیل کرنے کے لئے بر اہم خرچ دانہ اپنے ساتھ
لے جائے اور چونکہ دونوں صورتوں میں کرایہ آمد و رفت بذمہ خریدار
یا طلبگار ہوتا ہے - اس لئے ہمیں سفر کے لئے کوئی اہتمام
نہیں کرنا پڑتا - بس اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور سیٹی بجاتے ہوئے
گھر سے چل دئے - پس ایک ایسے ہی فیاض فطرت اور منعم
پروور محترم نے ایک دم کہا چلتے ہو ملا صاحب بمبئی ؟

یہاں خدا سے چاہتے تھے کہ کسی طرح ان سے کچھ دن
علیحدہ ہو کر دماغ کو افکار و آلام سے پاک کر لیں فوراً اسٹیشن
پر پہنچ گئے - فیشن پسندی دیکھئے کہ گاڑی روانہ ہونے میں جب
کوئی پانچ منٹ رہ گئے تب ہم مع بستر بیٹ فارم پر بغیر ٹکٹ کے
داخل ہوئے - نتیجہ یہ ہوا کہ گھبراہٹ میں ایک سکنڈ کلاس کے
اندر باہر سے بستر پھینک مارا جو ایک ہندوستانی افسر صاحب
کے اوپر جا پڑا - خیال تھا کہ ہمارے محترم میزبان نے ہمارا فرسٹ
کلاس کا ٹکٹ لے لیا ہوگا - بس اس غرور میں آ کر جو اندر داخل
ہوئے تو دیکھا کہ ایک ہندوستانی افسر صاحب نشۂ افسری میں
چور اعلیٰ درجہ کے وقار الملک بنے بیٹھے ہیں چہرے سے غرور و

نخوت اور اکڑفوں کے بیحد انگریزی آثار نمایاں ہیں - وجہ یہ تھی کہ خیر سے نسل کے تھے ہندوستانی مگر کسی اسلامیہ کالج میں تعلیم پاکر آپ سے باہر ہو گئے تھے - ادھر سو سوا سو روپیہ کی نوکری مل گئی تھی بس ہم تاڑ گئے کہ اب یہ افسر صاحب اپنی خموشی اور غضب آلود چہرے سے ہمیں مرعوب کرنا چاہتے ہیں - لہٰذا ہم نے اُن کے غرور کے آئینہ کو چور چور کرنے کی تیاریاں شروع کیں اور وہ اس طرح کہ گو ڈبے میں ایک سیٹ خالی تھی مگر ہم اُن کے برابر جاکر بیٹھ گئے - تو اُنھوں نے نہایت تحقیر کے ساتھ ہم سے کہا کہ یہ بستر آپ کا ہے ؟ ہم نے پہلے تو اُن کے سوال کا جواب ہی نہ دیا - وہ سمجھے کہ ہم نے سُنا نہیں - دوبارہ جب اُنھوں نے پھر سوال کیا تو ہم نے مُنہ پھیر کر صرف "اوہنہ" کہہ دیا - اب تو افسر صاحب کا نشہ اور تیز ہو گیا - اور آپ نے پہلا انتقامی حملہ یہ کیا کہ اُٹھ کر پنکھا اپنی طرف کھینچ لیا - ہم نے جواب یہ دیا کہ بغیر کسی انتظار کے فوراً کھڑے ہو کر پنکھے کا رُخ اپنی طرف کر لیا تو افسر صاحب کے غصہ کا پارہ کھول کر قارورہ بن گیا مگر غرور کا تقاضا یہ تھا کہ جو کچھ کریں ہم سے گفتگو کئے بغیر کریں - اس لئے اب افسر صاحب نے آہستہ سے اخبار پانیر پڑھنا شروع کر دیا ہم نے بھی ایک آنہ کا اخبار زمیندار لے لیا اور بجائے آہستہ پڑھنے کے بازاری

اور دو کاندارون کی طرح لگے اسے چلا چلا کر پڑھنے - جس سے افسر صاحب کی تمام انگریزی خراب ہوگئی اور وہ سکون سے پانیر نہ پڑھ سکے اتنے میں ہوشنگ آباد کا اسٹیشن آگیا تو افسر صاحب نے بڑے نخرے سے ڈائننگ کار سے انگریزی چائے طلب فرمائی تو ہم نے جھپٹ کر اڑھائی آنے پاؤ والی پوریاں خرید لیں واضح ہو کہ ریلوے اسٹیشنوں پر جو ہندوستانی کھانا ملتا ہے وہ کاغذ یا پتے پر دیا جاتا ہے اور کمال یہ ہے کہ پوریوں کے ساتھ جو آلو یا ترکاری دی جاتی ہے اس کا شوربا بھی اسی کاغذ پر دھر دیا جاتا ہے اور جب تھرڈ کلاس مسافران پوریوں کو ریل چلے جانے کے خطرہ سے پلیٹ فارم پر کھڑے کھڑے کھاتے ہیں تو پوریوں کا یہ شوربا اُن کی انگلیوں سے آبشار بن کر پلیٹ فارم پر چھڑکاؤ کرتا رہتا ہے - لہٰذا ہم نے اس بدتہذیبی سے بچنے کے لئے یہ کیا کہ پوریاں لاکر افسر صاحب کے بستر کے قریب رکھ دیں تو شوربے نے اپنا رخ افسر صاحب کی طرف کر دیا - اور ہم پوریاں کھانے میں مصروف ہو گئے - اب افسر صاحب نے ہمارے شوربے کو اپنے بستر کی طرف آتا دیکھ کر پہلے تو اپنے بستر کو کچھ کھینچنا شروع کیا - پھر ایک دم وائسرائے ہند کا سا چہرہ بنا کر کہا :-

"بھائی صاحب دیکھئے میرا بستر خراب ہو جائیگا"

مگر ہم نے ان کی اس اضطراب انگیز تنبیہہ کا جواب تک نہ دیا۔ اوٹھ کہہ کر پھر مصروف خورد و نوش ہو گئے اور جب فارغ ہوئے تو بغیر ہاتھ مُنہ دھوئے ایک سات نمبر بیڑی سلگا کر پینا شروع کردی تو اس انداز سے کہ بیڑی کا تمام دھواں ان کی طرف جانے لگا۔ اب جو افسر صاحب کا اس دھوئیں سے دم گھٹنے لگا۔ تو آپ نے لائڈ جارج کے فیشن کا رومال جیب سے نکال کر اپنی ناک پر رکھ لیا مگر ہم کہاں باز آنے تھے۔ کش پر کش تھے کہ لگائے چلے جا رہے تھے آخر کار تنگ آ کر افسر صاحب نے ہم سے انگریزوں کی زبان میں کہا :۔

"کہاں ہو تم جاتے ہوئے"

اس وقت ہمارے مُنہ میں بیڑی کا کوئی نصف دھواں باقی تھا اُسے اُن کی طرف اُڑا کر ہم نے اپنی ملکی اور مادری زبان اردو میں کہا :۔

"یقیناً آپ ہندوستان کے رہنے والے ہیں۔ اور اس لحاظ سے آپ کی مادری زبان اردو ہے اور ہم بھی مولا کے فضل سے ہندوستانی ہیں اور اسے آپ خوب جان گئے ہیں پھر کہئے کس لئے آپ ہم سے زبان انگریزی میں سوال فرمانے کی جرأت فرما گئے"

اس پر افسر صاحب ضرب خفیف تو بہت ہوئے مگر افسرانہ وقار قائم رکھنے کے لئے اب جو اردو بولے تو لہجہ برگاڑ کر۔ پھر ہم نے کہا جناب کا وطن؟ فرمایا بریلی تو ہم نے کہا کہ پھر آپ کا لہجہ تو انتہائی شیریں اور خدام الحرمین ہونا چاہئے یہ آخر زبان میں اکڑ کیوں ہے؟ افسر صاحب کی اس قدر اصلاح کے بعد اب ہم نے اُن پر اپنا رُعب یوں گانٹھا کہ اُن کے پہلے سوال کے جواب میں کہا:۔

ہم گورنمنٹ ہند کے انتخاب پر جرمنی میں پی۔ ایچ ڈی کی تعلیم کے لئے جا رہے ہیں۔

افسر صاحب۔ تو کیا آپ نے ہندوستان میں کوئی اعلےٰ ڈگری حاصل کی ہے؟

ہم۔ جامعۂ ملیہ دہلی کے ایم۔ ایس۔ سی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایل ایل۔ بی ہیں اور ان تمام امتحانات میں صوبہ بھر کے طلبہ کے مقابل اوّل نمبر پاس مانے گئے ہیں۔

افسر صاحب۔ مگر جامعۂ ملیہ کے طلبہ کو تو گورنمنٹ اپنے وظیفہ پر منتخب نہیں کرتی۔ پھر آپ کا انتخاب کیسے عمل میں آیا؟

ہم۔ جی ہاں یہ صرف جامعہ ملیہ کے اعلےٰ نصاب اُس کے طلبہ کے اعلےٰ اخلاق اور مسلمانوں کے طاقتور قومی

اتفاق پر موقوف ہے - اگر آج مسلمان جامعہ ملّیہ ایسے قومی و ملکی مرکز علم کو اپنا قرار دے کر اپنی تمام طاقتیں اس کی امداد پر صرف کر دیں اور اپنے اہل و عیال کو جامعہ ملّیہ میں بکثرت داخل کریں تو گورنمنٹ مجبور ہو کر جامعہ کے طلبہ کو بھی وہی قیمت دے جو دوسرے کارخانوں عرف کالجوں کے طلبہ کو ملتی ہے (اوپر لفظ اہل و عیال قومی جوش سے لکھ دیا ہے۔ اسے کاتب صاحب کی غلطی سمجھ لیجئے) ٭

افسر صاحب - اچھا تو جب آپ انگریزی میں اتنی قابلیت رکھتے ہیں تو آپ انگریزی میں گفتگو سے اس قدر برہم کیوں ہیں؟

ہم - سنو جی! زبان انگریزی اس لئے سیکھی ہے کہ بڑی تنخواہ کی ملازمت حاصل کریں اور جو زبان انگریز ہم پر حملہ ہو تو جواب دے سکیں ٭

افسر صاحب - مگر مسلمانوں کی موجودہ "انگریزی یافتہ" جماعت تو مغربی آداب اور معاشرت تک پر سو جان سے قربان ہے - پھر آپ اسے کیوں نہیں پسند کرتے اور پھر آپ تو جرمنی جا رہے ہیں ٭

ہم - تو اس سے یہ مقصد کہاں ہے کہ ہم جرمنی میں بھی ہندوستانی لنگوٹ باندھ کے پھریں گے - یا وہاں کے لوگوں

سے واللہ چنانچہ کے ساتھ گفتگو کرینگے - اماں، تم نے یہ نہ سمجھا کہ ضرورت کے تو ہم اوپر ہی قائل ہو چکے ہیں (یہاں لفظ اوپر بہ معنی پہلے ہی استعمال کیا تھا) ہم تو صرف بے ضرورت مغربی تقلید کے مخالف ہیں ٭

واضح ہو کہ اس وقت تک ہماری سگریٹ ہوئی بیڑی جلتے جلتے ہماری انگلیوں کے قریب آگئی تھی اور اس کے جلنے والے پتے کی چرچر آواز سے ہم سمجھے کہ اب بیڑی ختم ہوگئی تو ہم نے ایک آخری کش جو اور لیا تو افسر صاحب نے جلد سگریٹ پیش کیا مگر ہم نے شکریہ کہہ کر واپس کر دیا اور دم بخود رہ گئے ٭

واضح ہو کہ اس تمام مکالمے کے درمیان ہم ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھے رہے اور کسی طرح افسر صاحب سے مرعوب نہ ہوئے پس آنے والی نسلوں کو چاہیے کہ ہندوستانی افسروں سے ایسا ہی برتاؤ کریں تاکہ ان کے اخلاق ہندوستانی ہو جائیں ٭

(رسالہ پروانہ دربھنگہ)

۱۹۲۶ء کا مہمان

ایک تو غلامی پھر اُس پر تعلیم سے اسلامی تعلیم کا فقدان مسلمانانِ ہند کی عقل ہی نہیں بلکہ فطرت تک مسخ کر دینے کے لئے کافی تھا۔ چنانچہ "مہمان اور میزبان" کے وہ اصول و ضوابط جو اسلام نے سکھائے تھے اور جن سے اخوۃ و برادری کے اُن حیات پرور جذبات و تعلّقات کا بقا و استحکام مقصود تھا جن پر قوموں اور جماعتوں کی بین الاقوامی بنیادیں رکھی جاتی ہیں مسلمانانِ ہند سے یکسر فنا ہو چکے۔ چنانچہ آج مسلمانانِ ہند میں جس قسم کے مہمان پائے جاتے ہیں۔ اُن کے چند نمونے ذیل میں پیش ہیں ؎

علی گڑھ والے کہتے ہیں کہ انسانی تمدّن اور سوسائٹی کے لئے سائیکل۔ موٹر۔ ریل۔ جہازوں کا ہونا ہر طرح مفید اور ضروری ہے۔ لیکن دیوبند والے کہتے ہیں اور بہت ٹھیک کہتے ہیں کہ یہ تمام چیزیں قربِ قیامت کے وہی فتنے ہیں جن کے بعد دجّال کا جلوس نکلے گا اور ثبوت یہ دیتے ہیں کہ انہی چیزوں کے باعث آج ملک کا تیل۔ گھی۔ چمڑا۔ کپڑا۔ معدنیات اور جوتے تک

باہر چلے جا رہے ہیں اور ہم ہیں کہ ننگے بھوکے اور پیادہ پا پھر رہے ہیں۔ پھر آپ ہی کہئے کہ ان موٹروں اور ریلوں نے کیا فائدہ دیا؟ اور چونکہ ہم مذہبًا دیوبند والوں کے طرفدار ہیں۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ انہی چیزوں نے "مہمانی اور میزبانی" کا حساب کتاب بھی تباہ کر دیا ہے۔ مثلاً خدا بخشے جب ہمارے دادا صاحب زندہ تھے تو اُن کے پاس بھی مہمان آیا ہی کرتے تھے۔ طریق یہ تھا کہ جب کوئی مہمان آنا چاہتا تھا تو وہ اپنے وطن سے ہماری طرف آنے والے قافلوں کے ہاتھ خبر بھیجتا تھا۔ اوّل تو اُس زمانے میں تمام قافلے "اونٹ نشین" اور "خچر سوار" ہوا کرتے تھے اس لئے اوّل تو اُن کا صحیح سلامت پہنچنا ہی معلوم ہوتا تھا پھر اگر پہنچ بھی گئے تو مہمان صاحب کی اطلاع یوں ہوا کرتی تھی کہ۔

"اگر ہو سکا تو فلاں ماہ میں آئینگے"۔ "ورنہ بارش بعد"

گویا اطلاع سے چار ماہ تک تو موسمی رکاوٹ سے میزبان بے فکر ہو جاتا تھا۔ پھر اگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ سردی بھی پڑ گئی زمانے کی تو مہمان صاحب چار مہینے اور ٹھہر گئے۔ اب رہ گئے چار مہینے گرمی کے تو ان مہینوں میں قافلے پانی کی قلت سے سفر ہی نہیں کرتے۔ یا پھر یہ ہوتا تھا کہ طویل راستوں میں ندی۔ نالے۔ جنگل۔ پہاڑ۔ چور۔ ڈاکو۔ رہزن۔ اونٹ۔ بیل

گاڑی - پنجرہ اور غازی مرد کی سواری سے مہمان صاحب راستہ ہی میں سلفہ ہو کر پسپا ہو جاتے تھے اور میزبان اُن کی میزبانی کے جملہ مصائب سے محفوظ رہتا تھا - اکثر یہی ہوتا تھا کہ دادا صاحب مرحوم کے زمانے میں سوائے عزیزوں - رشتہ داروں کے اور کوئی مہمان آتا ہی نہیں تھا - لیکن اگر سفر کی مذکورہ مشکلات کے بعد بھی کوئی مہمان آ ہی جاتا تھا تو ایسے مہمان کے لئے دادا صاحب مرحوم ہی کیا اُن کے زمانے کے تمام لوگ بکرا یا مرغی ہی ذبح کیا کرتے تھے کیونکہ برسوں میں آنے والے مہمان کی قدر ایسی ہی ہوتی ہے جیسا کہ کہا ہے ؎

قدر کھو دیتا ہے ہر روز کا آنا جانا

لیکن اب یہ زمانہ ہے کہ ندی پر پُل - طوفان آئے - اور لے گئے - بجلی چمکی - لیکن جہازوں اور ریلوں کے ذریعہ مہمان صاحب کی اطلاع تین دن کے اندر اندر دنیا کے اِس سرے سے اُس سرے تک نہیں تو ہندوستان کے گاؤں گاؤں میں پہنچ ہی جاتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میزبان کیل کانٹے سے لیس بھی نہیں ہونے پاتا کہ مہمان صاحب حاضر - پس اس صورت سے آج ملک میں مہمانوں کی درآمد برآمد کی جو رفتار روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اُس کے نتیجہ میں دیکھنا ایک نہ ایک دن ہندوستان میں قحط

اور کمال پڑ کر رہیگا - اور اسی لئے علی گڑھ سے مولوی طفیل احمد ایڈیٹر رسالہ "سودمند" چلا رہے ہیں کہ کسی طرح سود لینا مسلمانوں کے لئے جائز کردو ورنہ اُن کی اقتصادی حالت تباہ ہوجائیگی بہرحال اِس وقت جس قسم کے مہمان ملک میں پائے جاتے ہیں اُن کی قسمیں ملاحظہ ہوں ؎

سرمایہ داروں کے مہمان

سرمایہ داروں کے ہاں کسانوں اور مزدوروں کی کافی کمائی ہوتی ہے - اِس لئے ان کے ہاں سائیکل - موٹر بگھی - اونٹ - محل - کوٹھی - باغ - بنگلہ وغیرہ بہت کچھ ہوتا ہے - اِن کے ہاں آنے والا مہمان صرف نصف گھنٹے پہلے بذریعہ تار اطلاع دیتا ہے اور سرمایہ دار کے ملازم اسٹیشن پر "پُرتپاک خیر مقدم" کے بعد اُسے ایسے نظر فریب دُروح پُرور محل میں ٹھیرا دیتے ہیں جو اگر اپنے ہاں کے بدھو خال تمباکو فروش کو مل جائے تو مارے خوشی کے ۲ منٹ ہی میں بلغ العلیٰ بکمالہ ہوجائیں - یہ مہمان ایک ہفتہ سے لے کر ایک مہینہ اور ایک برس بھی رہ سکتا ہے اسے سرمایہ دار میزبان کے ہاں سے پاسنگ شو سگریٹ - نیوی کٹ اور امپیریل سگریٹ کے بکس پینے کو - ناشتے میں چائے - کیک - ولایتی بسکٹ - انڈے حلوا - انار - سیب - انگور اور کیلا کھیلنے میں ہاکی - کرکٹ - بلیرڈ - تاش - کھانے میں مُرغ مچھلی کے کباب - مزعفر پلاؤ - پٹین -

قورمہ - سونے وقت بجلی کا پنکھا - بجلی کی روشنی پاؤں دبانے کے لئے خدام ملتے ہیں - اِس قسم کے مہمان اور میزبان ہر وقت انگریزی زبان میں گفتگو کرتے ہیں - گویا یہ مادر زاد یورپین ہی تو ہوتے ہیں - اِن میں کبھی قومی - مذہبی اصلاح اور ہمدردی کے عنوان پر گفتگو نہیں ہوتی +

ملازم مہمان اِس حصّہ میں وُہ مسلمان شریک ہیں جو صرف انگریزی زبان دانی پر "تعلیم یافتہ" کہلاتے ہیں - گویا ان کے بعد تمام دنیا کے علوم پڑھے ہوئے جاہل ہوتے ہیں - یہ لوگ کالجوں سے نکل کر سیدھے ملازمت میں منسلک ہو جاتے ہیں - ان کی مذہبی ناواقفیت کا یہ حال ہوتا ہے کہ سیدھی طرح اذان دینا بھی نہیں جانتے - جب یہ ملازمت شروع کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ "صاحب" سال کے آخر طویل چھٹی پر ولایت جاتا ہے اِس لئے یہ بھی چھٹی لیکر "وطن" جاتے ہیں - اَب اگر راستہ کے کسی شہر میں ان کا کوئی کلاس فیلو - اسکول فیلو - یا یونیورسٹی فیلو رہتا ہے تو یہ اُس کے ہاں ایک ہفتہ ضرور قیام فرماتے جاتے ہیں - اور کلاس فیلو صاحب اُن کی تواضع میں علاوہ مالی مصائب کے - "اپنے دفتر سے رخصت اتفاقیہ لیکر" انہیں شکار اور سیر و تماشے دکھلانے کی مصیبت بھی برداشت کرتے ہیں - اِس قسم کے مہمان

اور میزبان میں بجائے قومیت ۔ مذہبیت کے ملازمانی ۔ دفتری اور کالج کے واردات ماضیہ پر گفتگو رہتی ہے ٭

عزیز مہمان

رشتہ داری کا وسیع ہونا تو چنداں مضائقہ کی بات نہیں ۔ لیکن شرط یہ ہے کہ دولت بھی کافی ہو ورنہ ان رشتہ دار مہمانوں کی صورت پر میزبان کو کبھی نور ہی نظر نہیں آتا ۔ ان کے آنے سے میزبان کو روحانی مسرت ضرور ہوتی ہے اور اگر ان کے ساتھ چار پانچ من وزن کے بچے بھی ہوئے تب تو دن عید اور رات شب برات کا مزہ آتا ہے ۔ لیکن ان کے جانے کے بعد میزبان کو گھر کی صفائی ۔ گھر کا انتظام ۔ گھر کے بستر ے اور گھر کے برتن خصوصیت سے دوبارہ خریدنے پڑتے ہیں ۔ عزیز مہمانوں کے سلسلہ میں میزبان کے لئے سبھی جنمالال بقال کا قرضدار ہونا لابد و لازم ہے کیونکہ ابھی مسلمانوں میں شیخی کا مادہ فنا نہیں ہوا ۔ ایسے مہمانوں اور میزبانوں کے درمیان جمیدن ۔ وحیدن ۔ بیٹے میاں اور بیٹے میاں کی منگنی اور نکاح کی باتیں ضرور ہوتی ہیں ٭

ہموطن مہمان

یہ مہمان اگر آپ کو پردیس میں مل جائے تو سمجھ لو کہ بہت جلد آپ کو دیوالیہ نہیں تو کہیں کا "داروغہ جیل" ضرور بنا دیگا ۔ ہموطن مہمان دو صورتوں سے خالی نہیں ہوتا ۔ یا وہ کہیں سے اغوا ۔ اقدام قتل ۔ ڈاکہ ۔ سرقہ یا مارشل لا کے

کبھی نہ کسی جرم میں مبتلا ہو کر فرار ہونا ہے۔ اور پردیس میں آپ کو ہموطن پاکر آپ کے ہاں پناہ لیتا ہے اور دوسرے ہی دن ذریعۂ وارنٹ آپ کو بھی پناہ دہی کے الزام میں جیل تک نہیں تو کوتوال صاحب کے سامنے لے جاکر ان سے دو چار بے طرح غزلیں ضرور سنوا دیتا ہے۔ یا پھر وہ مفلس، مفلوک اور برطرف ہو کر تلاش معاش میں آپ کے پاس پردیس میں آتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ علاوہ میزبانی کے جملہ مصارف کے بہ تلاش معاش اور سفارش کی گھوڑ دوڑ میں بھی میرے ساتھ شریک کیجئے یہاں تک کہ وہ ایک دن اس شہر میں آپ کے نام سے کسی بھلے مانس سے کوئی رقم لے کر سیدھا گھر اس قسم کے مہمان اور میزبان میں اپنی اپنی پریشانیوں کا اظہار ہوتا رہتا ہے اور بس ؛

علمی مہمان

اب وہ دن تو گئے جب ارباب علم و فضل اور اصحاب کمال کی قدر و عزت کائنات عالم کی ہر چیز سے زیادہ تھی۔ وہ دن بھی گئے جب محمود و اکبر بادشاہ کے دربار میں شبراز سے سعدی مکہ معظمہ سے خواجہ حافظ۔ اور افغانستان سے فردوسی بلائے جاتے تھے۔ اور ہر صاحب علم و کمال کے استقبال کے لئے خود بادشاہ سائیکل کوسوں دور جاتا تھا۔ اور جب تک یہ علمی مہمان ان کے ہاں رہتا تھا بادشاہ اور امرائے شہر اس پر زر و جواہر نثار کیا کرتے تھے۔ الہ بخش خود وادا صاحب جب اکبر بادشاہ کے دربار

میں جاتے تھے تو تین تین ماہ مہمان رہتے تھے اور رخصت ہوتے تو
علاوہ جواہر و خلعت کے انعام میں "مواشی" بھی لاتے تھے اور
دادا صاحب مرحوم کے یہ انہی انعامی مواشی کی وراثت کا سلسلہ
تو ہے کہ آج ہم صاحبِ علم و قلم ہو کر بھی "ہل ہی چلا رہے ہیں"
غرض اب تو علمی میزبانی یہ ہے کہ آپ فلسفۂ عالم اور نظم
کائنات پر حکمت و معارف سے لبریز کتاب لکھ دیجئے اور
جا ٹھیریئے کسی شہر کی سرائے میں۔ پھر مہینوں پڑے رہیئے اگر
اس عرصہ میں آپ کی یہ معرکتہ الآرا کتاب کوئی بک ایجنسی
چند جلدوں کے معاوضہ میں خرید لے تو اسے "حسنِ اتفاق" سمجھیئے
قدردانی نہیں۔ اور جو یہ کتاب لے لے کوئی ٹیکسٹ بک ایجنسی
تو بس خود کو ہندوستان کا شکسپیئر تصور کیجئے۔ غرض آج کل
لیڈر، مقرر، مصنف، ناول نویس، ڈراما نگار، شاعر اور
ایڈیٹر خصوصیت سے علمی مہمان کہلاتا ہے۔ ان میں سے
ہر ایک کے آنے سے مسرت ہوتی ہے۔ ایسے مہمان کے لئے
میزبان دن اور رات کے کسی گھنٹہ میں خاموش نہیں رہ سکتا
کیونکہ اس قسم کے مہمان اور میزبان میں دن رات کسی نہ کسی
علمی موضوع۔ سیاسی مسئلے۔ اور قومی مرحلے پر تھکا فضیحتی
ہوتی رہتی ہے۔ ایسے مہمان کو شہر کے "بہترین" اور نظر نواز
مناظر دکھانے پڑتے ہیں سچلتے وقت مہمان بہ اجازت نہیں

تو بلے اجازت میزبان کے کتب خانے سے چند نادر کتابیں لے جاتا ہے۔ کیونکہ سُنا ہے کہ کتابوں کے سرقہ پر علمی لوگ حشر میں پکڑے نہیں جائینگے ٭

مان نہ مان مہمان یہ مہمان تمام قسم کے مہمانوں سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے اِس کی پہچان یہ ہے کہ یہ ہمیشہ بلا بُلائے اور بلا اِطلاع آتا ہے اور پھر ٹالے نہیں ٹلتا اِس قسم کے مہمان ذیل کے وجوہ سے پیدا ہوتے ہیں ٭

۱۔ یا وہ نوعمری ہی سے آوارہ ہو ٭

۲۔ یا اُس کی سوسائٹی اور احباب متمول اور فارغ البال ہوں اور اُس کی کفالت کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہوں ٭

۳۔ یا اُسے بے ٹکٹ دُنیا بھر کے شہر دیکھنے کا شوق تو کیا انفلوئنزا ہو گیا ہو ٭

اِس قسم کے مہمان کی عملی قوتیں مُردہ اور بیکار ہو جاتی ہیں اور اُس میں ذیل کی عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں ٭

۱۔ وُہ بے بُلائے معمولی سے معمولی ملاقاتی کے ہاں مع ایک خفیف سے بستر اور ایک صندوق کے حاضر ہو جاتا ہے ٭

۲۔ اُس میں شرم و حجاب کا مادہ باقی نہیں رہتا ٭

۳۔ وہ بلا وجہ میزبان کی ہر بات پر ہنستا اور خوب خوب داد دیتا ہے ٭

۴۔ وہ قصہ گو اور لطیفہ گو ہوتا ہے ٭

۵۔ وہ حال۔ زوال اور وقت پڑے تو نجومی بھی ہو جاتا ہے ٭

۶۔ وہ ہمیشہ میزبان کے ذوق کے موافق باتیں کرتا ہے ٭

۷۔ وہ عیاشی کے متعلق بھی قیمتی معلومات بہم پہنچاتا ہے ٭

۸۔ وہ برمحل اشعار خوب چست کرتا ہے ٭

اس قسم کا مہمان میزبان کی روٹیاں ہی تناول نہیں فرماتا بلکہ کپڑا۔ جوتا۔ بستر اور بس پڑے تو اہل وعیال کے لئے بھی آرڈر بھی وصول کر ڈالتا ہے۔ اس کی عمر اسی گداگری میں گزرتی ہے۔ اس کی گفتگو کا موضوع وہی ہوتا ہے جو میزبان کی دلچسپی کا باعث ہو۔ یہ میزبان کے گھر سے بخشش کے ساتھ رخصت نہیں کیا جاتا بلکہ نکالا جاتا ہے مگر اس پر بھی وہ بجائے سیدھا گھر جانے کے پھر کسی دوسرے شہر میں مہمان بن جاتا ہے۔ خدا راقم الحروف کے دوستوں کو اس مرض سے بچائے ٭

اب اسی قسم کے ایک مہمان اور راقم الحروف سے جو پالا پڑا اور جس کے اثر سے یہ مضمون لکھا گیا وہ بھی سن لیجئے۔ سچ کہا ہے کہ اس زمانے میں بی اے پاس نہ کرنا۔ افلاس و تنگ دستی کا مستند سرٹیفکیٹ ہے۔ پس جب ان دیوبند والوں کے کہنے سے

ہم انگریزی زبان ایم۔ اے تک پڑھ کر بھولے ہیں آج تک وہی میر صاحب بنے پھر رہے ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ انہیں کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ ایک کم دس متعلقین اور پانچ اور تیس روپیہ ماہوار آمدنی میں جیسی گزر کرتے ہیں ہم جانتے ہیں یا وہ جانتی ہیں۔ پس رات کے کوئی گیارہ بجے ہوں گے کہ آگئے۔ آواز آتے ہی ہم پہچان گئے اور سمجھ لیا کہ اب دو تین ماہ تک ٹلنے کے نہیں۔ اس لئے گھبراہٹ میں ترکیب یہ کی کہ ان کے ذریعہ کہلا دیا کہ وہ تو کانپور گئے ہیں اور کوئی دو تین ماہ میں واپس آئینگے۔ مگر مہمان صاحب کا جواب ملاحظہ ہو ارشاد ہوا کہ

اچھا بیٹی ہیں ہوں۔۔۔ لو یہ ذرا بستر رکھ لو اور اندر سے کمرہ کھول دو اس کو کہتے ہیں مداخلت بیجا بہ خانہ بوقت شب۔ پھر حکم صادر ہوا کہ بیٹی ٹانگے والے کے پیسے ہاتھ بڑھا کر دے دو۔ اسے کہتے ہیں استحصال بالجبر۔ احکام کی تعمیل کی گئی تو کمرہ میں آگئے پہلے تو دو چار مرتبہ بے ضرورت کھانسے پھر فرمایا کہ بیٹی اگر کچھ کھانا ہو تو دروازہ سے دے دو وغیرہ۔ اب کہئے بلا وساطت ہمارے ان سے یہ باتیں کرنا "اغوا" نہیں تو اور کیا ہے ہائے ادھر ہم اس شش و پنج میں کہ یا خدا ہم نے تو کہلا دیا ہے کانپور کا اب جو کل ہم اسی گھر سے برآمد ہوئے تو پھر؟

غرض چار و ناچار پہلے دن تو کھڑکی کے راستہ سے دفتر چلے گئے

مگر شام کو جب گھر آئے تو معلوم ہوا کہ "بیٹی بیٹی" کہہ کر اِس وقت تک ہزاروں فرمائشیں کر چکے ہیں اَب کوئی اُن سے دریافت کرے کہ یہ پانچ ہزار زرِ نقد مہر ادا کرنے کے بعد ہماری منکوحہ جائداد اِن کی بیٹی کہاں سے ہو گئی؟ بہرحال ان سے ملے تو گھبرا کر فرمایا کہ ہیں آپ کہاں؟ آپ تو کانپور گئے تھے؟ جی ہیں تو آیا کہ کہہ دیں کہ اچھا جب ہم کانپور جا چکے تھے تو پھر آپ ہمارے گھر میں کہاں؟ مگر آئیں بائیں شائیں کر کے چپ کر دیا تو اُنہوں نے بھی زیادہ تحقیق گوارا نہ فرمائی کیونکہ اُنہیں تو مہمانی سے کام۔ کسی کے افلاس سے کیا واسطہ؟ ادھر تعلیم کے زمانے میں مولویوں میں جو رہے ہیں تو اُنہوں نے آخرت کے عذابوں سے ڈرا ڈرا کر ہمیں اِس قدر خلیق۔ متواضع اور ملنسار بنا دیا ہے کہ اَب اِن انگریزوں کی طرح بے مروت اَور خود غرض بھی نہیں بن سکتے۔ اِس لئے تھوڑی دیر کے لئے اخلاقاً ان کے پاس جو بیٹھ گئے تو بس آ گئی مصیبت اور مہمان صاحب نے ہمارے ذوقیات کا اندازہ کر کے سیاسیات عالیہ سے لے کر گاندھی۔ محمد علی۔ شوکت علی اور شُدھی و سنگٹھن کے جملہ لوازم و اسباب پر تقریر کر ڈالی اَور ستم بالائے ستم یہ کہ فنِ انشاء پر اعتراض کر کے ہمارے مضامین پر تنقید بھی کر گزرے مگر داد دیجئے ہم کو کہ ہم نے مہمان صاحب کو یوں خموش کیا کہ جمائیوں کا تار باندھ دیا اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو فی منٹ

ایک سو ایک ضرب جمائی کی سرکیں تو مضمحل ہو کر فرمایا
کہ اچھا تو آپ آرام فرمایئے +
دوسرے ڈھائی مہینے کی مہمانی کے بعد ہم نے یہ ترکیب کی کہ
انسپکٹر صاحب سی آئی ڈی سے اپنے نام اس مضمون کا فرضی
خط لکھوایا کہ آپ کے ہاں جو صاحب ٹھیرے ہوئے ہیں۔
وہ مشکوک ہیں۔ ہم نے جب سی۔ آئی۔ ڈی کا یہ خط قبلہ مہمان
صاحب کو دکھایا تو گھبرا گئے اور اسی دن کی ریل سے ...+

Taj Tahir Foundation

خوش طبعی

اگر آپ کو کسی قوم کی علم دوستی۔ صحت فکری تحقیق فاتحانہ اور جہانگشا جذبات بلند حوصلگی۔ مروّت اور عزم کامل سے ایسی عدیم النظیر قوتوں کا اندازہ کرنا ہے تو اس کے افراد میں ظرافت اور خوش طبعی کی قوت کو تلاش کیجئے ؎

خوش طبعی کو بعض لوگ۔ خوشدلی۔ ظرافت۔ تفنن۔ زندہ دلی مزاح۔ مذاق ہنسی۔ دل لگی بھی کہتے ہیں۔ لیکن اردو اصطلاحات میں اس لطیف ملکہ کو افکار و حوادث۔ واردات و باتیں یا طائفات و لطائف۔ نکات و لطائف۔ گپ شپ۔ شگوفہ کاری۔ سرمایہ افکار حاضرہ۔ باغ و بہار۔ کف گلفروش۔ زار و نیار۔ چہلہ خطرہ بازی اور ویلو بندیں خواطر سوانح بھی کہتے ہیں۔ کہئے کیا سمجھے ؟

خوش طبعی ایک ایسی قوت ہے۔ جو ہر انسان میں موجود ہوتی ہے بشرطیکہ وہ لندن سے ہندوستان میں اشر ہو کر نہ آئے مگر اس قوت کے زندہ رکھنے یا ابھارنے والے چند مخصوص محرکات ہیں۔ مثلاً وہ مرد یا مرد کسی ایسے حصۂ زمین پر پیدا ہوا ہو یا پیدا ہوتی ہو۔ جس کی آب و ہوا میں اعتدال۔ ترقی اور علو و

برتری کے اثرات ہوں اور وہ شخص ۱۸ یا ۲۰ سال کی عمر تک مربائے گوسپنی کا پانی بھی نوش نہ فرمائے اور یہ اثرات ایسی ہی زمین کو حاصل ہوتے ہیں جہاں گرمی سے زیادہ سردی اور ژالہ باری سے زیادہ برف باری ہوتی ہو۔ پس ایسی ہی زمین والوں کو آزاد خیالی درجہ اوّل۔ تندرستی درجہ اوّل۔ معارف پسندی درجہ اوّل۔ خوش دلی درجہ اوّل اور ظرافت پسندی درجہ اوّل عطا ہوتی ہے۔ لیکن جو قومیں کہ سورج کے بالکل ہی نیچے آباد ہیں خواہ وہ ہندوستان ہی کیوں نہ ہو اُن کے اندر افسردگی درجہ اوّل اور بدصورتی درجہ اوّل۔ پست ہمتی درجہ اوّل۔ بدمذاقی درجہ اوّل۔ خشکی درجہ اوّل اور بلغم درجہ اوّل عطا ہوتا ہے اور اگر ایسی قوموں کو غلامی بھی نصیب ہو جائے تب تو اُن میں بے حسی۔ جمود۔ تاریک خیالی۔ اور مردہ دلی درجہ اوّل بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ ایسے افراد جو زندہ دلی کے جوہر سے عاری ہوتے ہیں۔ ان کی صحت اور دماغی جودت ہمیشہ بے تک سی رہا کرتی ہے۔ جیسے اپنے ہاں کے مہاجن جن کے پاس سوائے موٹاپے اور چپ سادھنے کے اور کچھ نہیں۔ لیکن اگر غلامی کی فضا اور غلامی کی تعلیم کسی قوم میں طاری و ساری ہو تو اس کے جملہ اقسام کے افراد پر مردہ دلی۔ وحشت۔ چڑچڑے پن۔ مایوسی۔ سراق۔ بدحواسی۔ اور جنون کے ساتھ ہی غرور۔ نخوت۔ خود پسندی۔ اکڑفوں اور عمر فیش کا بھوت سوار ہو جاتا ہے۔

تک سوار ہوگی اور جب دیکھو وہ مارے نخرے کے "گورنر جنرل جلاس کونسل" بنا ہوا نظر آئیگا - چنانچہ ثبوت میں ہندوستانیوں ہی کو دیکھ لو ٭

قاعدہ کی رو سے ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ سب سے زیادہ خوش طبع لوگ وہ ہوتے جو علم و عقل کی دولت سے سرفراز ہیں - لیکن گیہوں اور گھی کی گرانی کہئے یا پولیس والوں کی فوجداری کہ ہندوستان کا تعلیم یافتہ آدمی ہی خشکی - مردہ دلی اور نحوت میں سب سے آگے نظر آتا ہے اور پھر غلامی کی عقلمندی یہ کہ اس جاوبے جا خشکی کا نام رکھا ہے وقار و متانت - چنانچہ آپ کسی بڑے فاضل ہندوستانی کے مکان پر جاکر صرف آواز دے دیجئے بس وہ اگر گھر میں بیٹھا قہقہہ بھی لگا رہا ہے تو باہر آکر آپ سے یوں ملیگا - گویا وہ گھر میں بیٹھا رو رہا تھا یا رونے والا تھا یا رونے ہی کو تھا یا آپ نہ آتے تو وہ رو ہی پڑتا یا رو کر رہتا - یا روتا ہی رہتا - یا آپ کی ملاقات کے بعد وہ رو کر ہی رہیگا یا رہیگی ٭

آپ کسی پرانے تعلیم یافتہ کے پاس جائیے وہ گھر سے باہر دانتوں میں خلال کرتا ہوا آئیگا پھر ڈکار بالجہر اور انگڑائی بالمشافہ لیتا ہوا دو چار جمائیاں بھی لیگا اور ضرور جمائی لیگا (یہاں ڈکار بالجہر اور انگڑائی بالمشافہ کی حرفی نحوی ترکیب پر غور نہ کیجئے) پھر وہ

آپ سے خیریت وخیر وعافیت از درگاہِ خداوند کریم شب و روز نیک چاہ کر دیگر احوال جو کہیگا تو اس قدر کہ مسواک اور جانماز۔ وضو کا لوٹا۔ اور صرف و نحو یا منطق پر بحث کے بعد اگر زیادہ خوش دل ہوگا تو بلکہ افغانستان کی بے پردگی پر دو چار سنا دیگا۔ خلافت والوں کو چندے کا چور ثابت کریگا۔ اور اخبارات کی خبروں پر بھروسہ کرنے کو حرام قطعی ثابت کرتا ہوا گھر میں چلا جائیگا۔ اس وقت آپ زیادہ سے زیادہ یہ کرینگے کہ لَا حَوْلَ وَلَا اِسْتَغْفِرُ اللّٰہ نعوذ باللّٰہ اور یرحمک اللّٰہ کہتے ہوئے واپس آجائینگے مگر آپ اُسے کبھی مسکراتا ہوا بھی دیکھ پائینگے بلکہ وہ گھر میں یہی کہتا ہوا سنا جائیگا کہ

"اجی تم بڑی مسرف ہو پانی اس قدر کیوں صرف کرتی ہو۔ وضو مکروہ ہو جاتا ہے"

پھر آپ نئی جماعت کے صاحب علم و فضل کے پاس جائینگے تو یہ بھی سگار پیتے ہوئے یا سیٹی بجاتے ہوئے باہر آجائینگے اور آتے ہی خلافت کمیٹی۔ جمعیتہ العلماء۔ کانگریس۔ سر آغا خاں۔ مولانا محمد علی۔ شوکت علی۔ ظفر علی خاں۔ سالک بٹالوی۔ مقاطعۂ جوعی۔ یا لیٹ جانا بہ امید سوراج۔ یا پولیس کے ڈنڈے کھانا بجھول سوراج کو برا بھلا کہہ کر کسی پہاڑ پر ایک "شانتی نیکی تان" عرف اسکول بنانا مفید عام و خاص ثابت کر کے پھر گھر میں چلے جائینگے۔ مگر بقدر نصف سیکنڈ بھی ان کے چہرے پر خوش دلی۔ مسرت یا لطافت

یا تبسم نظر نہ آئیگا - اور اُلٹا حلیہ یوں بنا لینگے کہ چہرے کی ڈاڑھی -
مونچھ - بھون - پلک اور عمامہ باندھنے کی جگہ کو اُسترے سے اتنا
گھونٹ کر رکھ دینگے کہ آپ اُسے کبھی کبھی "نانبا" بھی کہہ سکیں -
کھدر کی ایک ساری نما چادر بدن پر ہوگی اور پاپا ہرسنہ یا پاؤں
میں دو آنے والی چپلی - ورنہ کھڑاؤں پہ گویا ہندوستانی فلاسفہ حکما
اور ارباب عقل و خرد کا خلعت فاخرہ ہوا کرتا ہے جس میں تفنّن
خوش دلی - اور خوش طبعی کا کہیں گزر ہی نہیں اور ان لوگوں کو
دیکھ کر آپ کو مان لینا پڑیگا کہ ہندوستان کا علامہ نہ کبھی
مسکرایا تھا - نہ آج مسکرائیگا - نہ ہنسا - نہ ترسوں - نہ
سرسوں - اب یہاں سے آپ اگر کسی کالج زدہ یا یونیورسٹی رسیدہ
نوجوان عرف گریجویٹ کے مکان پر پہنچ گئے تو آپ اس کے
دروازہ پر نہ دستک دے سکینگے نہ یہ کہہ کر آواز دے سکینگے کہ

"اماں ذرا باہر تو آؤ"

تو آخر کب تک کھڑے رہیں ؟

لو یہ جانتے ہیں - تم خود شام کو میرے گھر آجانا ؟

نہ آپ اس کے دروازہ کی کنڈی کھٹکھٹا سکینگے نہ ہلا
سکینگے نہ بجا سکینگے نہ چھو سکینگے - اور نہ اُس گھر کے کسی بچہ
سے یہ کہہ سکینگے کہ -

جاؤ - اپنے ابا کو بلا لاؤ یا

اپنے ابا کو باہر بھیج دو۔ یا اپنے میاں سے کہنا کہ کوئی باہر آیا ہے یا اپنے ابا جان سے کہہ دینا کہ کالیخان آئے تھے سلام کہہ گئے ہیں یا اپنے ابا کو ہمارے گھر بھیجا سے پانچ منٹ کے لیے بھیج دینا وہ بھولنا نہیں تو اچھا سن لیا۔ یا سنا بھی کہ نہیں؟ یا سنے بھی ہو کہ نہیں؟ یا سمجھے بھی کہ نہیں؟ یا کہو گے بھی کہ نہیں؟ یا بولو گے ہو کہ نہیں؟

اور یہ گھر سے باہر نکلنے کے تمام ویسی طریقے آپ اس خوف سے اختیار نہ کرینگے کہ صاحب مکان ہیں گریجویٹ ایسا نہ ہو کہ اس قسم کی حرکات سے وہ ناراض ہو جائیں کیونکہ نرالے کیے ہیں بہت تیز یعنی خشک۔ اس لئے آپ یہ کرینگے کہ ایک ایسا "کارڈ زادہ" ان کی خدمت میں بھیجا جائیگا جس پر آپ کا نام انگریزوں کی زبان میں لکھا ہوگا۔ پھر آپ گلاغات کے کمرے میں بٹھا دیئے جائینگے مگر انتظار کا وقت آپ اس طرح نہیں گزار سکتے کہ کرسی پر بیٹھ کر ٹانگ پر ٹانگ رکھ لیں اور اس میں سے ایک ٹانگ کو دوسری ٹانگ پر رکھ کر مسلسل ہلاتے بھی رہیں یا کوئی رسالہ گرنگا سامنے رہیں۔ تھوڑی دیر میں گریجویٹ صاحب خانہ سمگار پہنے ہوئے آپ کے پاس آئینگے۔ اب اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ آپ ان سے علم، تنخواہ اور دولت میں کم ہیں تو یہ گریجویٹ صاحب آپ کے ہر مسئلہ پر گفتگو تو کرینگے لیکن ہنسی شگفتگی اور

تبسم کو چہرہ کے قریب نہ آنے دینگے کہ وقار و متانت میں کمی نہ آجائے ٭

اب لکھے پڑھوں کی اس خشک دنیا سے نکل کر آپ ایک ہندوستانی تاجر کے پاس جائینگے یہ شخص دکان کے دروازہ پر ایک گول میز کے اندر بیٹھا ہوگا - خواہ یہ دکان بمبئی - کلکتہ یا کم از کم دہلی کے کسی ایسے حصہ میں ہو جہاں شام کے وقت اپنے خواجہ حسن نظامی صاحب کے بیٹھ جانے کا امکان ہو - عام اس سے کہ اس دکان کا نام "بھیا احسان کی دکان" ہی کیوں نہ ہو ؟ پس اس ہندوستانی تاجر کا نام اگر جنرل مرچنٹ نہیں تو "اینڈ سنز" ضرور ہوگا - اس کا لباس کثیف سے بھی زیادہ کثیف ہوگا - چہرہ کا رنگ قند سیاہ اور قد اپنے مولانا احمد سعید صاحب جمعیتہ والوں کے برابر جسمانی توانائی کا یہ عالم ہوگا گویا ابھی ابھی پٹیالہ میں زبسکو کو چت کر کے آرہے ہیں - یہ تاجر تہمد ضرور باندھے ہوگا - یا باندھے بیٹھا ہوگا یا باندھ رہا ہوگا - یا باندھنے کے لئے کھڑا ہوگا - یا باندھ کر بیٹھ رہا ہوگا - یا باندھنے کے لئے اٹھ رہا ہوگا یا باندھتا جائیگا اور آپ سے بھی باتیں کرتا جائیگا یا باندھ ہی رہا ہوگا کہ آپ پہنچ جائینگے - پھر آپ اس سے کھانے پینے کے متعلق جس قدر سوالات کرینگے ان کے جوابات یہ نہیں بلکہ اس کے دوسرے لنگوٹ بند ملازم دینگے جو ہوٹل میں ادھر ادھر چائے کی پیالیاں بجاتے پھرتے ہونگے - پھر آپ دام ادا کرتے وقت

اگر اس تاجر سے کوئی سوال کرینگے تو یہ تاجر چھ لمبر بیڑی کا سارا دھواں آپ پر اڑا کر جو جواب دیگا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ

لینا ہو تو لو ورنہ رستہ صاف کرو

اور جو آپ نے کسی چیز کے داموں میں کمی چاہی تو یہ تاجر آپ کے تمام پیسے پھینک کر لڑنے مرنے کو بھی کھڑا ہو جائیگا مگر اس کے چہرہ پر ہنسی۔ خوش طبعی۔ یا تبسم کی کوئی خفیف سی حرکت بھی محسوس نہ ہوگی ✤

پھر آپ یہاں سے ہندوستانی فوجی آدمی کے پاس جائینگے۔ تو آپ اس کی مونچھوں کو اوپر کی طرف چڑھا ہوا پائینگے وہ تو تڑاق سے بات کرنے کو بھی تیار ملیگا۔ لیکن اگر اسے یہ اطلاع مل جائے کہ تم کل ملک چین کے لام پر جاؤ گے تو اس کی تمام آن بان کافور ہو جائیگی۔ اور یہ گھر میں والدہ۔ والد۔ بھائی اور ان سے مل مل کر روئیگا اور روتا رہیگا اور والدہ سے لام پر نہ جانے کے لئے دعا کرائیگا۔ تعویذ باندھیگا اور جب بس نہ چلیگا تو ملازمت سے استعفا دیدیگا۔ مگر یہ نہ ہوگا کہ وہ ہنسی خوشی لام پر چلا جائے۔ یا جاتے وقت بھی اس کے چہرے سے تبسم اور خوش طبعی کے آثار نمایاں ہوں ✤

یہ سب کچھ نتیجہ ہے غلامی۔ افلاس۔ بے ہنری۔ جہالت اور ضعف صحت کا اور ہندوستان میں دماغی اور ذہنی لطافت کا فقدان اب

اس قدر زیادہ بڑھ گیا ہے کہ جن لوگوں کے نام عبداللطیف۔ لطیف بیگ اور لطافت حسین ہیں۔ ان کے چہروں پر بھی کبھی تبسم اور خوش دلی نظر نہ آئیگی۔ خوش طبعی کو تباہ کرنے والی چیزوں میں "نخلِ میاں کی والدہ" تفریحات سے گریز۔ بڑے مولوی صاحب کے ہم عمر لوگوں کی صحبت میں رہنا اور ہمارے مضامین کا مطالعہ نہ کرنا بھی داخل ہے۔ آج کل خوش طبعی کو زندہ رکھنے کا بہترین ذریعہ کسی کلب کا ممبر بن جانا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہندوستانی کثرت سے ایسے کلب بنائیں جہاں سب کے سب جمع ہو کر خوش طبعی کی قوت کو بڑھانے زندہ رکھنے اور حاصل کرنے کی تدابیر پر عمل پیرا ہوں کیونکہ جس قوم سے خوش طبعی رخصت ہو جائے وہ دنیا میں مشکلات اور مصائب کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور سوراج بغیر مصائب برداشت کئے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کوشش کیجئے کہ آپ دن رات میں ایک گھنٹہ بہت زور سے یا ذرا زور سے یا کسی قدر تیزی سے ہنس لیا کریں یا ہنسا دیا کریں اور اس کا بہترین ذریعہ اخبار "ہمدرد" کی خریداری ہے اور وہ بھی مستقل خریداری۔ یہ نہیں کہ آپ محلہ کے کسی خریدار سے مانگ کر پڑھ لیں۔ کیونکہ "ہمدرد" میں آپ ہمارے مضامین انشاء اللہ تعالےٰ پڑھ سکیں گے۔ یہاں لفظ انشاء اللہ آئندہ کے معاوضہ میں لکھا گیا ہے۔ مثلاً یوں کہہ سکتے ہیں کہ "ہمدرد" کی اشاعت انشاء اللہ تعالےٰ میں ہمارا نہایت پر لطف مضمون شائع ہوگا انتظار کیجئے۔

محبت نامے

یعنی

میاں بیوی کے خطوط

مصنفہ

بابو ستیش چندر چکرورتی

مترجمہ

پروفیسر رام سروپ کوشل

اس کتاب میں میاں کے خطوط
بیوی کے نام۔ اور بیوی کے خطوط
میاں کے نام درج ہیں۔ اور ان
میں سسرال کی زندگی کو پُر لطف
اور کامیاب بنانے کے متعلق
نہایت دلآویز انداز میں خیالات
ظاہر کئے گئے ہیں۔ زبان سلیس
اور شستہ۔ قیمت ۷ر

ملنے کا پتہ

دارالاشاعت پنجاب لاہور

aj Tahir Foundatio